رشید احمد صدیقی

کردار
افکار
گفتار

مالک رام

خیام پبلشرز
ادب کی تابندہ قدروں کا درخشاں نشان

رشید احمد صدیقی

کردار افکار گفتار

مرتب
مالک رام

خیام پبلشرز
چوک اردو بازار۔ لاہور ۲

پاکستان میں پہلی بار
۱۹۸۳ء

رشید احمد صدیقی

کردار افکار گفتار

مرتب :۔۔۔۔ ڈاکٹر مالک رام
ناشر :۔۔۔۔ عبدالرشید
مطبع :۔۔۔۔ زاہد بشیر پرنٹرز لاہور۔

قیمت -/۲۷

فہرست

پیش لفظ

اردو دنیا کی مشہور زبانوں میں غالباً سب سے کم عمر ہو، لیکن مختصر زمانۂ حیات کے باوجود اپنی ادبی فتوحات کے لحاظ سے ان میں سے بیشتر کی ہم پلہ اور بعض پر فوقیت رکھتی ہے۔ جہاں تک نظم و شعر کا تعلق ہے، کمیت کے پہلو سے یہ کسی سے پیچھے نہیں۔ کیفیت میں بیشک تعداد میں زیادہ شاعر ہم دنیا کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں، لیکن جو اس عالمی معیار پر پورے اُترتے ہیں، وہ کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم مرتبہ نہیں کہے جا سکتے۔ انھیں ایسی کسی اصول یا ناپ تول سے بھی پرکھیے، آپ میر، غالب، انیس، اقبال کو کسی سے ہیٹا نہیں پائینگے۔

نثر میں ادب تک تو ٹھیک ہو، لیکن علم کی مختلف شاخوں میں ہم ابھی تک کئی زبانوں کے برابر نہیں پہنچ سکے۔ اس کے اسباب و علل پر بحث کرنے کا نہ یہ محل ہے، نہ اس مختصر تحریر کا مقصد۔ میں یہاں اُردو میں صرف طنز و مزاح کے سرمایے کے بارے میں مختصراً کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات کا آغاز گفتگو ہی میں اعتراف کر لینا چاہیے کہ اُردو میں اس صنف کا بلند پایہ منظوم یا نثری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں۔ ہمارے ہاں تصنیف و تالیف کی ابتدا مذہبی حلقوں کی مرہونِ منت رہی۔ ان اصحاب کا مقصود یا تو لوگوں کو دین کی باتیں سکھانا اور سمجھانا

تھا، یا اخلاق کے مسائل کی تعلیم دینا۔ اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اساساً یہ دونوں باتیں ایک ہی اصل کی فرع ہیں؛ ان میں نہ تضاد ہے نہ تفاوت۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات میں ہنسی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں تھی، بلکہ بعض متقشف بزرگ تو عین ممکن ہو اسے موضوع کی ثقاہت کے منافی سمجھتے۔ بھلا ایسے ماحول میں طنز و مزاح کا کیا دخل تھا! یہ صورتِ حال تو توں قائم رہی۔

اس راہ سے انحراف سودا نے کیا۔ اور تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ اس میں حیرتناک حد تک کامیاب رہے۔ لیکن ان کا خاص میدان ہجو تھا۔ ان کے سامنے فارسی کے متعدد ہجو گو شعرا کا کلام موجود تھا۔ لیکن محض نمونے سے کوئی شخص قابلِ لحاظ یا کامیاب اور کارآمد چیز پیدا نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ خود اس کے اپنے اندر تخلیقی صلاحیت اور نمونے سے بہتر چیز پیش کرنے کی لیاقت موجود نہ ہو۔ سودا میں علم و عقل کی کمی نہیں تھی۔ اس پر ان کے مزاج کی جھلاہٹ اور زود گوئی اور زود حسی مستزاد۔ ان کی ہجویں اُردو کے شعری سرمایے میں آج تک منفرد ہیں۔ لیکن ہجو، نہ مزاح ہو نہ طنز۔ ان کی بعض نظموں (مثلاً شہر آشوب) میں طنز کے نمونے تو ضرور ملتے ہیں؛ لیکن بحیثیت مجموعی مزاح کا عنصر ان کے ہاں بہت کم ہے۔

ان کے بعد رنگین اور انشا کی بدولت ہمارے ہاں ریختی کا رواج ہوا، لیکن یہ صنفِ سخن ضلع جگت سے آگے نہ بڑھ سکی، اور کہیں کہیں تو اس سے بدنما حد تک عریانی اور ابتذال کو فروغ ہوا۔ میرے نزدیک ریختی کا مثبت پہلو صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے عورتوں کی بولی ٹھولی اور مخصوص محاورے محفوظ ہو گئے۔

لیکن انشا کے ہاں مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں، اگرچہ نہ ان کی تعداد زیادہ ہے، نہ معیار بلند۔ تاہم جو کچھ ہے غنیمت ہے۔

اس کے بعد اودھ پنچ اور اکبر کا دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اکبر کبھی کبھی پنچ میں بھی لکھا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہو کہ جہاں تک خالص مزاح اور ظرافت کا تعلق ہے، اُردو کے پورے شعری سرمایے میں اکبر کا جواب نہیں۔ ہاں البتہ طنز میں شبلی ان کے مدِ مقابل ہیں، اگرچہ اس کا افسوس ضرور ہو کہ شبلی نے بہت کم کہا؛ ان کے طنز کے موضوع زیادہ تر سیاسی ہیں۔

القصہ بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو ہمارے کلاسکی شعری ذخیرے میں طنز و مزاح کے میدان میں صرف

چار نام قابل ذکر ہیں: سودا، انشا، اکبر، شبلی؛ اور ان میں بھی معتدبہ کلام صرف اکبر کا ہو۔
لیکن جب ہم زمانۂ حال تک پہنچتے ہیں، تو یہ عالم ہی دوسرا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب مغربی اثرات کے تحت ہمارے مزاح نگار محض لفاظی سے کام نکالنے کی جگہ اپنی منظومات میں خوشدلی اور مسرت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس سے قاری کے احساسات لطیفہ میں گدگدی بھی پیدا ہوتی ہے اور انھیں سکون بھی ملتا ہو۔ زمانۂ قریب کے شعرا میں مقبول حسین ظریف لکھنوی، ہرچند اختر، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خان، سید محمد جعفری، غلام احمد فرقت کاکوروی خاص طور پر کامیاب رہے ہیں۔

انصاف کی بات یہ ہو کہ نظم کے مقابلے میں ہماری نثر طنز و مزاح کی صنف میں کہیں زیادہ کامیاب ہے؛ اور بلحاظ کمیت بھی اس میں کہیں وافر نمونے ملتے ہیں۔

نثر اردو میں مزاح داخل کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ انھوں نے خط کیا لکھے، صفحۂ قرطاس پر زعفران زار کی گلکاری کردی۔ ان خطوں کو لکھے سو برس سے زیادہ ہو گئے، بلکہ ان میں سے بعض تو سوا سو برس سے بھی زیادہ کے ہیں؛ لیکن ان کی تازگی اور شگفتگی اور مسرت آفرینی اور نتیجۃً مقبولیت میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ رقعات بالکل نجی قسم کے ہیں۔ مکتوب الیہ وہ اصحاب ہیں، جو غالب کے عزیز دوست یا شاگرد تھے۔ لامحالہ ان خطوں میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، وہ فریقین کی شخصی دلچسپی سے تجاوز نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم آج نہ مکتوب الیہ کو جانتے ہیں، نہ ان مسائل کو، جو غالب اور مکتوب الیہ کے سامنے تھے، نہ ان تعلقات کی گہرائی کا ہمیں اندازہ اور علم ہے، جو فریقین کے درمیان تھے۔ لیکن تحریر کا کمال یہ ہے کہ پس منظر سے بالکل نابلد ہوتے ہوئے بھی، نہ صرف ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں، بلکہ ان میں کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔

غالب کے مزاح کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ بیساختہ ہے؛ اس میں سراسر آمد ہو، جس میں آورد کا کہیں کوئی شائبہ نہیں۔ حالی نے اسی لیے انھیں "حیوان ظریف" کہا ہو۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ظرافت ان کی فطرت کا جزو تھی، یعنی یہ وہبی تھی، اس کا اکتساب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تمہید نہیں اٹھاتے، پینترے نہیں بدلتے، بلکہ ان کی تحریر کی پوری فضا سرور آگین ہے۔ اس میں ان کے اسلوب نگارش اور سلاست زبان کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کے اسلوب کا کمال تو یہ ہے کہ یوں لگتا

ہے۔ جیسے زیر مطالعہ خط کسی اور کے نہیں، خود آپ کے نام لکھا گیا ہو۔ چونکہ بقول ان کے انھوں نے نامہ نگاری کو مکالمہ بنا دیا ہے کہ اس سے قاری کی دلچسپی شروع ہی سے بیدار ہو جاتی ہے؛ وہ محسوس کرنے لگتا ہے، گویا وہ اسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ زبان چونکہ الّا ماشاء اللہ بیحد سلیس ہے، اس سے بات چیت اور یگانگت کا احساس اور بھی قوی ہو جاتا ہے، اور معلف دو بالا۔

غرض کہ غالب کے خطوط ہمارے ادب کے وہ سدا بہار پھول ہیں، جو نہ کبھی باسی ہونگے، نہ کبھی ان کے پڑھنے سے اردو والوں کی سیری ہو گی۔

غالب کی وفات سے کچھ ہی پہلے (۱۸۷۷ء میں) منشی سجاد حسین کاکوروی نے لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا۔ اس کا خیال انھیں، یقین ہے کہ لندن کے مشہور ہفتہ وار پنچ (انگریزی) سے آیا ہو گا۔ لیکن دونوں کے مذاق میں وہی فرق تھا، جو انگریزی اور ہندستانی قوموں میں، یا دوسرے لفظوں میں لندن اور لکھنؤ میں تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے، جب لکھنوی ادب میں ضلع جگت اور محاورہ بازی اور صنائع بدائع کی کارفرمائی تھی۔ اکبر الٰہ آبادی اور نواب سید محمد آزاد کے سوا سے اودھ پنچ کے بیشتر مضمون نگار بھی لکھنؤ ہی کے ادیب اور شاعر تھے۔ ایسے میں محال تھا کہ اودھ پنچ کے مزاح میں وہ لطافت یا بلندی پیدا ہو سکتی، جو اعلیٰ درجے کی ظرافت کی جان ہے۔ اور جس ماحول میں ان حضرات نے تربیت پائی تھی، اور اس وقت لکھنؤ کا جو مذاقِ سخن تھا، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، ان سے زیادہ کی توقع رکھنا بھی قرینِ انصاف نہیں۔

اودھ پنچ کے ہاں طنز اور پھبتی کی بھرمار ہے۔ اسی لیے اس کی تحریروں میں جلی کٹی اور تہتک اور استہزا کی بھی کمی نہیں۔ ایسی چیزیں وقتی طور پر اپنا کام ضرور کر جاتی ہیں، لیکن ان میں پائیداری نہیں ہوتی؛ اور تربیت یافتہ ذہن ان سے جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہو کہ اگرچہ اودھ پنچ کا ذکر اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں ناگزیر ہے، لیکن اس کے مضامین کسی انتخاب میں مستقل مقام حاصل نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب کے بعد نثر میں جس ادیب نے قابلِ لحاظ پہلو سے کچھ پیش کیا، وہ

رتن ناتھ سرشار ہے۔ "فسانۂ آزاد" سرشار کا وہ کارنامہ ہے، جو اردو کے ساتھ زندہ رہیگا۔ بیشک، کہیں کہیں اس کی زبان ثقیل اور عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہو گئی ہے، لیکن عام طور پر اس کی دلچسپی اور دلکشی قائم رہتی ہے۔ اور خوجی کا کردار تو سرشار کی ایسی تخلیق ہے کہ اگر وہ اور کچھ بھی نہ لکھتے (اور انھوں نے بہت کچھ اور لکھا ہے) تو صرف یہی ایک نام انھیں حیاتِ ابدی عطا کرنے کو کافی تھا۔

سرشار کے بعد اہمیت کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ظفر علی خان کے نام سامنے آتے ہیں۔ یہ سب حضرات طنز کے استاد ہیں۔ البتہ، مولانا محمد علی کے ہاں مزاح وظرافت کے نمونے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اسی عہد کے دو اور مزاح نگاروں نے بہت نام پیدا کیا۔ یہ ہیں سید محفوظ علی بدایونی اور ولایت علی بمبوق؛ اور ان دونوں میں بھی محفوظ علی کا مقام بلند تر ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ افسوس کہ کسی نے آج تک بمبوق کے مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ظفر علی خاں نے اس باب میں ایک اور طرح سے بھی اردو کی خدمت کی۔ یہ اُن کا روزنامہ "زمیندار" ہی تھا، جس کے ذریعے سب سے پہلے روزانہ فکاہی کالم پیش کرنے کی رسم پڑی۔ عبدالمجید سالک اس میں "افکار و حوادث" کے عنوان سے ہر روز فکاہی شذرات لکھتے تھے؛ اور جب انھوں نے غلام رسول مہر کے ساتھ اپنا اخبار "انقلاب" جاری کیا؛ تو یہ کالم بھی وہاں منتقل ہو گیا۔ وہ یہ کالم کم و بیش ۳۰ برس تک لکھتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تحریریں نہیں دیکھی ہیں، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کی گل افشانیِ گفتار کا معیار کیا تھا، اس میں کتنا تنوّع تھا۔ کاش کہ کوئی شخص مختلف عنوانوں کے تحت دو تین جلدوں میں ان کا انتخاب شائع کر دیتا! یہ ہمارے ادب کی مستقل خدمت ہوگی۔

سالک کی دیکھا دیکھی، فکاہی کالم ہماری صحافت کا گویا جزوِ لاینفک بن گیا۔ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ایک چراغ حسن حسرت کے سوائے کوئی ان کی گرد

کو بھی نہ پہنچ سکا۔ سالک کی کامیابی کا راز ان کی فطری ظرافت کے علاوہ ان کے علم و فضل اور قدرت زبان میں مخفی تھا۔ وہ فارسی اور عربی دونوں میں طاق تھے، اور ان کی اللہ تحریر میں آپ کو کہیں غلطی نہیں ملیگی۔ یہی حال حسرت کا تھا۔ اسی لیے وہ سالک سے پیچھے نہ رہے۔ ان کے دوسرے مقلدوں کے لیے یہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس صحافتی ظرافت کے میدان کے باہر دو اور اصحاب قابل ذکر ہیں۔ میری مراد پطرس (احمد شاہ بخاری) اور تاج (امتیاز علی) سے ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا۔ لیکن ان کی کتابیں "مضامین پطرس" اور "چچا چھکن" بقامت کہتر" ہونے کے باوجود "بقیمت بہتر" ہی نہیں، بلکہ ان کے بغیر اردو کے مزاحی ادب کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ نہ صرف یہ بلکہ چچا چھکن بھی سرشار کے خوجی کی طرح ہماری زبان کا ضرب المثل کردار ہے۔

یہی زمانہ رشید احمد صدیقی کے منصۂ شہود پر آنے کا ہے، جن کے بارے میں آپ آئیندہ صفحات میں بہت کچھ پڑھینگے۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کی دو خصوصیات اہم اور قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ ان کی ظرافت تبسم زیر لب کی ظرافت ہے۔ نہ وہ خود کھلکھلا کر ہنستے ہیں (قہقہہ مارنا تو بہت دور کی بات ہے) نہ وہ کسی کو کھلکھلا کر ہنسنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سخت گرمی کے موسم میں اگر بالکل ہلکی ہلکی سی ہوا چلنے لگے، تو آپ کا رواں رواں فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت رشید احمد صدیقی کے مزاح کی ہے۔ اس میں شدت نہیں، بلکہ انبساط و اہتزاز کی ایک زیریں لہر ہے، جو آپ پر مستولی ہو جاتی ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئی آپ سے پوچھے کہ اس کا منبع کیا ہے، تو بتائے نہ بنے؛ اس کا تعلق پوری فضا سے ہے، نہ کہ کسی ایک لفظ یا جملے سے۔ لیکن یہ اتنی لطیف ہے کہ اس سے کما حقہٗ لطف اندوز ہونے کے لیے قاری کا تعلیم یافتہ اور پڑھا لکھا ہونا لازم ہے۔ اور وہ جتنا زیادہ تعلیم یافتہ اور پڑھا لکھا ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوگا۔ ان کی دوسری خصوصیت، ان کی جھلاہٹ ہے۔ آپ کو ان کی

کسی تحریر میں کوئی مبتذل کلمہ یا اشارہ نہیں ملیگا ۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی، اس میں ادب آداب کی مسلّمہ اقدار کا مذہب اور شریعت کی طرح خیال کیا جاتا تھا، بلکہ ان کے خیالات کی تشکیل میں ان کے پیشے کو بھی بہت دخل دیا ہے ۔ وہ ساری عمر درس و تدریس میں مشغول رہے ہیں ۔ ہمارے نوجوانوں کی کم از کم تین نسلیں ان کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہو کر ملک و ملت کی خدمت کرنے کے لائق ہوئی ہے ۔ سقراط کی طرح رشید احمد صدیقی کو بھی ساری عمر اس بات کا شدید احساس رہا ہے کہ ان کے شاگرد ملک کے مستقبل کے مالک اور خادم ہیں ۔ اور وہ ان دونوں فرائض سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ انھیں نیک اور بد، راستی اور کجی، صداقت اور دروغ کا صحیح صحیح علم ہو ۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دس من پند و نصیحت کے مقابلے میں چھٹانک بھر مثال زیادہ کارگر ہو سکتی ہے ۔ اس صورت میں وہ اپنے شاگردوں کے سامنے قولاً یا فعلاً اپنے مرتبے اور مقام سے فروتر کوئی نمونہ بھلا کیونکر پیش کر سکتے تھے !

ان کے ہمعصروں میں نیاز فتحپوری اور عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں ۔ نیاز فتحپوری نے کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا، اس کا معیار بہت بلند ہے ۔ ان کے ہاں مزاح اور طنز دونوں کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں، اور رکھ رکھاؤ اور اخلاق و آداب میں وہ بھی رشید احمد صدیقی سے کسی طرح کم نہیں ۔ یہ بات عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی ؛ ان دونوں کا قلم کہیں کہیں بے راہ ہو گیا ہے ۔

الغرض ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی نے جس معیار اور پایے کا ظرافتی اور طنزیاتی ادب ہمیں دیا ہے، وہ قدرِ اوّل کی چیز ہے ؛ اور اس میدان میں بہت کم ان کے حریف ہیں ۔

مالک رام

کردار



رشید احمد صدیقی
۱۹۷۳

سیّد عابد حسین

رشید و مرشد

شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

مگر ہمارے "مالکِ تحریر" بندۂ پیر کو بھی نہیں بخشتے۔ چنانچہ مجھے حکم ہوا کہ تحریر کے رشید نمبر (نذرِ رشید) کے لیے جو وہ ترتیب دے رہے ہیں، کچھ لکھوں اور جلد لکھوں۔ میں ہمیشہ سے سست قلم ہوں۔ اور اب چند سال سے تو میرے لیے کچھ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہا۔ پھر جب جلد لکھنے کی فرمائش ہو، تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور قلم چلانا درکنار، قلم اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ایک عزیز دوست، دوسرے عزیز دوست کی خدمت میں صحیفۂ محبت و عقیدت پیش کر کے وہ فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں جو ہر اردو ادیب بلکہ اُردو دوست کے لیے فرضِ عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید صدیقی صاحب کم و بیش ۶۰ برس سے اُردو کو بنانے، سنوارنے، نکھارنے، اس میں خوش طبعی و شوخی اور رنگینی کی دلآویزی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ بصیرت و معنویت کا وزن و وقار پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ "تحریر" کی تدوین کا کام ایک مدت سے مالک رام صاحب کا حصہ ہو گیا ہے۔ اگر اس سلسلے میں رشید صاحب کا ذکر نہ ہوتا تو بہت بڑی کمی رہ جاتی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے

مالک رام صاحب نے اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود، اربابِ اُردو کے لیے یہ ارمغانِ تازہ پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایسی صورت میں، یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ میں اس مبارک کام میں تھوڑا بہت ہاتھ نہ بٹاؤں! چنانچہ میرِ کارواں کے کئی تقاضوں کے بعد میں نے رہی سہی طاقت کو جمع کر کے اپنے واماندۂ راہ قلم کو بھی اس کاروانِ شوق کے ساتھ جادہ پیمائی پر آمادہ کر لیا۔

چل میرے خامے بسم اللہ

پہلے اس مضمون کے عنوان کی توجیہ اور وضاحت۔ ساری اُردو دنیا جانتی ہے کہ رشید صاحب کو ذاکر صاحب مرحوم سے غیر معمولی محبت اور عقیدت تھی اور ہے۔ وہ ان کو مزاح مُشا خلوص کے ساتھ "مرشد" کہا کرتے تھے اور آج بھی اندوہ و حسرت کے لہجے میں اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ رشید صاحب ہی کے واسطے سے میری ملاقات ذاکر صاحب سے ہوئی، جنھیں آگے چل کر میں نے بھی طریقِ زندگی میں اپنا رہنما بنا لیا۔ رشید صاحب اور ذاکر صاحب کا باہمی تعلقِ خاطر مجھے شروع ہی سے ایک طلسمِ حیرت نظر آیا اور سالہا سال تک میں اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا کہ ان دونوں میں خیالات، مذاق اور مزاج کے اختلاف کے باوجود اس قدر گہری، سچی اور پکی الفت کیوں ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مجھ پر یہ بھید کھلا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس موقع پر رشید صاحب کی خدمت میں ہدیۂ نیاز اس طرح پیش کروں کہ ان کی زندگی اور سیرت کا ایک اہم پہلو یعنی ذاکر صاحب کے ساتھ ان کے رُشد و ارشاد کے تعلق کی نوعیت جو اب تک میری نظر میں ایک معمّا تھی اور شاید مجھ جیسے اور کم نگاہوں کی نظر میں اب بھی ہو، حل ہو جائے۔

گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت

جون یا جولائی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ میرے بی۔اے کے امتحان کا (جو میں نے میور سنٹرل کالج، الٰہ آباد سے دیا تھا) نتیجہ نکل آیا۔ میں اوّل درجہ میں کل امیدواروں میں دوسرے

منبر پر پاس ہوا تھا۔ نواب زادہ حمید اللہ خان (جو آگے چل کر نواب بھوپال ہوئے) ۱۹۱۵ء سے میرے تعلیمی اخراجات کے کفیل رہے تھے۔ ان کے حکم سے میں نے ایم اے او کالج، علی گڑھ میں ایم اے (انگریزی ادب) میں داخلے کی درخواست دی۔ اس کی منظوری کے بعد غالباً آخر ستمبر یا شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب کالج تعطیل کلاں کے بعد کھل رہا تھا، مجھے علی گڑھ پہنچنا تھا۔ وہیں ایک اجنبی مقام تھا جہاں میرا کوئی ایک شخص بھی جاننے والا نہیں تھا، جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔
جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں ایم اے او کالج کے ان طالب علموں میں جو بی اے کا امتحان دینے الہ آباد آئے تھے اور مسلم ہوسٹل میں ٹھہرے تھے، رشید صاحب بھی تھے۔ میں اس ہوسٹل میں ۱۹۱۰ء سے رہتا تھا اور علی گڑھ سے جو مہمان آتے تھے، ان سے معمولی صاحب سلامت ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح رشید صاحب سے بھی ہوئی۔ شاید اسی وقت سے ان سے کچھ ربط پنہاں پیدا ہو گیا ہوگا کہ مجھے خیال آیا، ان کو خط لکھوں اور یہ درخواست کروں کہ کالج اور ہوسٹل میں داخلے کے مراحل طے کرنے میں میری مدد کریں۔ چنانچہ میں نے جی کڑا کر کے انہیں خط ڈالا۔ پانچویں چھٹے دن ان کا جواب آگیا، جس کے ہر لفظ سے خلوص اور گرمجوشی چھلکتی، بلکہ ٹپکتی تھی۔ علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ رشید صاحب، سید محمود کو رٹ کے اتالیق کی حیثیت سے آدم جی پیر بھائی منزل کے اندرونی حصے میں رہتے ہیں۔ وہاں پہنچا تو اس طرح ملے، جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں، اور اصرار کر کے اپنے ساتھ ٹھہرایا۔ شاید یہ شگون تھا کہ ایک دن ہم دونوں ایک دوسرے کے پیر بھائی بن جائیں گے۔
ان دنوں ملک میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت کا زور تھا۔ اور قومی رہنما ہر طبقے اور ہر پیشے کے لوگوں کو جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے معلم اور منتظم بھی داخل تھے، انگریزی حکومت کے ساتھ ترک تعاون پر ابھار رہے تھے۔ علی گڑھ میں بھی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جو کالج کے ٹرسٹیوں میں شامل تھے اور دوسرے

ٹرسٹیوں کو اس پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے کہ حکومت سے کالج کو جو امداد مل رہی تھی، اس سے دست بردار ہو کر تحریک آزادی کے علمبردار بن جائیں۔ اب یہ خبر گرم تھی کہ علی برادران اور دوسرے قومی رہنما علی گڑھ آکر براہِ راست کالج کے معلموں اور طالب علموں سے اپیل کرینگے کہ ایم، اے، او کالج کو چھوڑ دیں اور اس کی حریف و مقابل جامعۂ ملیۂ اسلامیہ میں (جسے علی گڑھ میں قائم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا) شریک ہو جائیں۔

اس سے سارے کالج میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ جدھر دیکھو، یہی چرچا تھا۔ رشید صاحب کے یہاں سہ پہر سے شام تک ان کے کچھ خاص احباب کی ایک "بزم بے تکلف" برپا ہوتی تھی۔ اس کے بے ضابطہ صدر ذاکر صاحب ہوتے تھے۔ جن کو رشید صاحب اور ان کی آواز بازگشت کے طور پر دوسرے دوست بھی "مرشد" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے حسن صورت و سیرت، جودت طبع، تقریر کی لذت اور مجموعی شخصیت کی کشش کا ذکر میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اور شاید مسلم ہوسٹل (الہ آباد میں بی، اے، یا ایم اے، پر یوس کے امیدواروں میں جو علی گڑھ سے امتحان دینے آئے تھے)، ان کی ایک جھلک بھی دور سے دیکھی تھی، مگر ملاقات کا شرف اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ رشید صاحب کے یہاں اپنے قیام کے پہلے یا دوسرے دن سہ پہر کی بزم بے تکلف میں ان کی زیارت ہوئی اور روا تھی ان کی موہنی نے ایک ملاقات میں میرے دل وحشی کو موہ لیا۔ ان صحبتوں میں طرز کلام عام طور پر گپ شپ، نوک جھونک، قہقہوں، چہچہوں کا ہوتا تھا، مگر موضوع کلام اکثر سنجیدہ مسائل ہوتے تھے، خصوصاً ترک تعاون کی تحریک اور ایم، اے، او کالج پر اس کے امکانی اثرات۔ شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی شرکائے بزم ترک تعاون کے ہنگامے کو ملک کے لیے اور خاص طور پر تعلیمی اداروں کے لیے مضر بلکہ مہلک سمجھتے ہیں۔ مگر جب ہم لوگوں نے ان دنوں ملک کے سیاسی رہبروں کی حمیت خیز اور ولولہ انگیز تقریریں سنیں، اور جامعۂ ملیہ

کی تاسیس کے جلسے میں جو کالج کی مسجد میں منعقد ہوا تھا، شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کا بصیرت افروز، ولولہ زا اور جاں سوز خطبہ سُنا، تو ہم میں سے بعض کے دل و دماغ میں ردّ و قبول کی کشاکش نے ایک طوفان اور ہیجان برپا کر دیا۔ میں ان دنوں یہ کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ریاست بھوپال سے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے کو وظیفہ مل جائے، اور بظاہر اس کوشش میں کامیابی کی توی اُمید تھی۔ اس لیے ملک کی سیاست کی طرف میری توجہ بہت کم تھی۔ پھر بھی کالج کی عام فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے اپنے تاثر کو غالب کے ایک شعر کی تضمین میں ظاہر کیا۔ جس کے صرف یہ چند شعر اس وقت یاد آرہے ہیں:

دنیا میں کچھ عجیب تلاطم ہے ان دنوں
اک کشمکش میں دیکھتا ہوں بحر و بر کو میں
دل بھی ہے ایک چھوٹی سی دنیا بجائے خود
ہلچل میں یاں بھی پاتا ہوں ہر خشک و تر کو میں
"چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ رشید و مرشد میں باوجود انتہائی الفت اور یگانگی کے طرز فکر اور نظریۂ حیات کے اعتبار سے جو فرق تھا، اس کا کچھ اندازہ میرے تحت شعور کو اسی وقت ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ سطحِ شعور پر اُبھر آیا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی حالت اس بحران کے زمانے میں حافظ کے شعر میں صرف ایک لفظ بدل کر یوں بیان کی جا سکتی ہے:

من کجا کشمکشِ رَدّ و قبولم ز کجا
حیف باشد دلِ "مومن" کہ مشوش باشد

اور مومن کی تعریف اگر رشید صاحب سے اس وقت پوچھی جاتی، تو وہ حالی کے شعر میں تصرف کر کے یہ کہہ سکتے تھے:

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
رشید تری اُلفت ترے کالج کی ولا ہے

اسی تلاطم کو جاری رکھتے ہوئے اس باطنی کشمکش کو جس سے ڈاکٹر صاحب اس وقت

گزرو رہے تھے، اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

میں تو تھوڑے ہی دن بعد کالج سے، جو اس دوران میں یونیورسٹی بن گیا تھا، رخصت ہو گیا، مگر جاتے جاتے میں نے یہ منظر دیکھ لیا کہ رشید صاحب وفاداری اور استواری سے مقام ایمان پر قائم رہے اور ذاکر صاحب زبانِ حال سے۔

نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر است

کہتے ہوئے جامعۂ ملیۂ اسلامیہ میں جنگِ آزادی کے تعلیمی محاذ کے سپاہی اور آگے چل کر سپہ سالار بن گئے ہیں۔

اس کے بعد کے پانچ برس کی مدت میں، جس کا بڑا حصہ میں نے آکسفرڈ اور برلن میں گزارا، رشید صاحب سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا، ذاکر صاحب میرے برلن پہنچنے کے چند ہی مہینے بعد ہندوستان سے جرمنی آ گئے، اور برلن یونیورسٹی میں جہاں میں کچھ پہلے سے پڑھ رہا تھا، داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی میں میرے اور ان کے مضامین اور کلاس الگ الگ تھے۔ مگر قیام ہم دونوں کا اور محمد مجیب صاحب کا جو آکسفرڈ میں اپنی تعلیم ختم کر کے فنِ طباعت حاصل کرنے کے لیے برلن آئے تھے، کم و بیش تین سال تک ایک ہی خاندان کے خود کفیل مہمانوں کی حیثیت سے ایک ہی مکان میں رہا۔ اس زمانے میں، میں نے اور مجیب صاحب نے جو ایک سال پہلے سے میرے ساتھ رہتے تھے، ذاکر صاحب کو ہر رنگ میں، خلوت و جلوت میں، کلفت و مسرت میں، تمکین و سکوت و سنجیدگی میں، نشاط و گل افشانی تقریر میں، وجد و وارفتگی کے عالم میں، "چناں کہ افتد و دانی" کی منزل میں دیکھا، پرکھا اور کھرا سونا پایا، جس میں کھوٹ نام کو بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے جادو نے ہم دونوں کو بےخودی اور بےخبری کی حالت میں نہیں، بلکہ بہ ثبات ہوش و حواس مسحور کر لیا؛ اور جرمنی میں تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ہم ان کے ساتھ کچھ

دھلگے میں ہند سے ہندستان آکر جامعہ ملیہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔
اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں اور ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب
ہوئے۔ ہم دونوں سال میں دو بار علی گڑھ جاتے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، عموماً
رشید صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ جیسے میں پہلے رشید صاحب کے واسطے
سے ذاکر صاحب [illegible] اب ذاکر صاحب کی معرفت رشید صاحب سے میری باسی دوستی
تازہ ہو گئی۔ اگلے ۱۸ ۔ ۱۹ سال میں رشید صاحب سے ششماہی ملاقاتوں اور
ان کی مہمان نوازیوں کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ بلکہ گاہے ماہے اور ملاقاتیں
بھی ہوتی رہیں۔ اس عرصے میں رشید صاحب کو بہت قریب سے دیکھتا رہا اور
ان کی ذہنی اور اخلاقی صفات کا نقش میرے دل پر گہرا ہوتا گیا۔ رشید و مرشد
کے ساتھ ان صحبتوں کا مزہ دل ہی جانتا ہے، اُسے زبان و قلم سے بیان کرنا ممکن
نہیں۔ ذوقِ ادب ہم تینوں کا بڑی حد تک یکساں تھا۔ اس لیے شعر و شاعری، ادب
و انشا کے موضوعات پر گفتگو چھڑ جائے، تو آپس میں خوب گھٹتی تھی۔ ملکی
سیاست کے بارے میں، میں اور ذاکر صاحب، رشید صاحب کے خیالات اور نظریات سے
بعد المشرقین رکھتے تھے۔ اس لیے یہ موضوع بہت کم زیرِ بحث آتا تھا۔ اور
اگر کبھی آ بھی جائے، تو معاملہ نوک جھونک سے آگے نہ بڑھتا۔ اور اس میں بھی کچھ
کم لطف نہیں تھا۔

مگر سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سیاست میں ہم تینوں میں، اتفاق
رائے تھا۔ ان دنوں اس سیاست کا مرکز ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی ذات شریف
تھی۔ میں اور ذاکر صاحب ممبران کورٹ کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو ڈاکٹر
ضیاء الدین کی پالیسیوں کو یونیورسٹی کے حق میں سخت مُضر سمجھتے تھے۔ اور ان کی
شخصیت اور اقتدار و کردار کا جو اثر یونیورسٹی کی عام فضا خصوصاً طالبعلموں کی
زندگی پر پڑ رہا تھا اس کی وجہ سے بہت فکر مند تھے۔ رشید صاحب، سر سید، محسن الملک اور وقار الملک کے
علیگڑھ کالج کو چشمِ مجنوں سے دیکھتے تھے اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ یونیورسٹی

بننے کے بعد اس کا جو استحالہ ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں ہو رہا ہو وہ خدا نخواستہ اس کی صورت و سیرت کو مسخ نہ کردے، وہ ہم سے کہیں زیادہ غمگین اور پریشان رہتے تھے۔ اور جہاں تک حالات اجازت دیتے، قول و عمل سے ہماری تائید کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ تقسیم ہند کے اثرات نے مسلم یونیورسٹی کے لیے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی۔ بہت سے برادران وطن کو جن میں بعض ارباب حکومت بھی شامل تھے، یہ یقین تھا کہ یونیورسٹی تحریک پاکستان کا مرکز رہی ہے اور یہ شبہ تھا کہ اب بھی وہ بھارت کی سرزمین پر پاکستانی اڈے کا کام کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کی عام فضا خصوصاً اس کے بہت سے قابل طالبعلموں کا تعلیم سے فارغ ہوتے ہی پاکستان کا رخ کرنا اور وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جانا، اس شبہے کو اور تقویت پہنچا رہا تھا۔ غرض ملک میں خصوصاً یوپی ریاست میں مسلم یونیورسٹی بہت سی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور بہت سے دلوں میں یہ ارادہ تھا کہ اس کی مرکزی حیثیت کو ختم کر کے اسے الٰہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کی طرح ایک ریاستی ادارہ بنا دیں۔ ذاکر صاحب کا مادر یونیورسٹی سے قلبی اور روحانی رشتہ تھا۔ اور اب وہ کورٹ اور مجلس منتظمہ کے ممبر کی حیثیت سے ایک حد تک اس کو چلانے کی ذمہ داری میں شریک تھے۔ اسی لیے ظاہر ہے کہ انھیں اس صورت حال سے سخت کوفت اور تشویش تھی۔ مگر جامعۂ ملیہ کے عام کارکنوں میں بھی بہت سے لوگ جو مسلم یونیورسٹی میں طالبعلم یا معلم رہ چکے تھے اور غالب کے اس شعر کے مصداق تھے:۔

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اس خطرناک بحران سے جس سے یونیورسٹی گزر رہی تھی، اس درجہ متاثر تھے کہ وہ اسے دشمنوں کی یلغار سے بچانے کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے، کرنے کو تیار تھے۔ انھوں نے سنا تھا کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد، ذاکر صاحب کو علی گڑھ بھیجنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ اس نازک وقت میں یونیورسٹی کی پشت پناہی اور رہنمائی کریں، مگر ذاکر صاحب ابھی

رہے ہیں کہ جامعہ کی کشتی کو منجدھار میں چھوڑ کر کیسے جائیں ۔ اہل جامعہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذاکر صاحب کے چلے جانے سے جامعہ کی توسیع اور ترقی کے سارے منصوبے جو انھوں نے تھوڑے ہی دن پہلے اس کی سلور جبلی کے موقعہ پر بنائے تھے، خواب پریشاں ہو کر رہ جائیں گے ۔ پھر بھی انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے قیمتی تعلیمی سرمایے کی حفاظت کو جامعہ کی ضرورت پر مقدم سمجھا اور اس کی خاطر اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا ۔ ان کے دو نمایندوں نے مولانا آزاد سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ ذاکر صاحب کے بغیر بھی جامعہ کا کام کسی نہ کسی طرح چلتا رہیگا؛ اور اہل جامعہ کو ان کے علی گڑھ جانے پر اعتراض نہیں، بلکہ اصرار ہے ۔ غرض ۱۹۴۸ء کے آخر میں ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ سنبھال لیا، اور اب رشید و مرشد ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم بھی بن گئے ۔

مجھے ذاکر صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لینے کے تھوڑے ہی دن بعد یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کا ممبر بنوا دیا تھا ۔ چنانچہ اب میں بار بار اور جلد جلد علی گڑھ جانے لگا ۔ میرا قیام تو ذاکر صاحب کے یہاں ہوتا تھا ۔ لیکن دوران قیام میں رشید صاحب کی زیارت قریب قریب روز ہی ہو جاتی تھی ۔ اب ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں شعبۂ اردو کی صدارت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذاکر صاحب کی مدد کے لیے کسی ہال کی نگرانی کا وبال بھی اپنے سر لیا تھا ۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب کے علانیہ اور خفیہ مخالفوں کی سازشوں کی خبر رکھنے اور ان کا توڑ کرنے کی ذمہ داری بھی زیادہ تر انھیں پر تھی ۔

اس زمانے میں مجھے رشید صاحب کی زندگی اور شخصیت کو ہر رنگ میں دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے انھیں ہر رنگ میں چوکھا پایا ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر چند رشید اور مرشد دونوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے ادارے کی فلاح و بہبود کی (جو خود اپنی فلاح و بہبود نہیں چاہتا تھا) جد و جہد میں اس طرح کھپا دیا تھا کہ انھیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملنی چاہیے تھی، مگر وہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ گھڑی بھر کے لیے روزمرہ کی فکر جاپ کو بھول کر دو چار احباب خاص کی بزم بے تکلف میں لطائف و

ظرائف سے محظوظ ہو لیں۔

اسی زمانے میں میرے ذہن میں یہ معمّہ حل ہوا کہ رشید صاحب اور ذاکر صاحب کے درمیان اکثر نظریات و خیالات میں تخالف کے باوجود نہ صرف قلبی اتحاد، بلکہ عملی تعاون کیسے طرح ممکن ہوا، خصوصاً جب کہ رشید صاحب آزادی سے پہلے کے علی گڑھ کو فردوس گمشدہ سمجھتے تھے، اور ذاکر صاحب کی رائے میں وہ جاگیرداری نظام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی۔

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

تو پھر آزادی کے بعد نئے علی گڑھ کی تشکیل و تعمیر میں دونوں مل کر کیسے کام کر سکے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ رشید صاحب اور ذاکر صاحب میں دو صفات کا اشتراک ان سارے اختلافات پر بھاری تھا جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ان مشترک صفات کو ہم "دردِ دل" اور "ذرجائے مومن" کہہ سکتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں کی کچھ تھوڑی سی تشریح کرنی پڑے گی۔

"دردِ دل" عشقیہ شاعری میں اس کرب و الم کی کیفیت کا نام ہے، جو عاشق پر محبوب کے ہجر میں گزرتی ہے۔ مگر متصوفانہ شاعری میں اس کا مفہوم ہے، وہ رقّتِ قلب، جس کی بدولت اہلِ دل نوعِ انسانی بلکہ کل مخلوقات و موجودات کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے صوفی شعراء نے اس غم دوران کو شرطِ انسانیت قرار دیا ہے۔ یہ خیال ان کے کلام میں رچا اور بسا ہوا ہے۔ یہاں صرف دو تین مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا:

چیست انسانی، تپیدن از غمِ ہمسایگاں
از سمومِ نجد، در باغِ عدن پژمان شدن (حالی)

دردِ دل پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی، اور یہی انساں ہونا (چکبست)

اور خواجہ میر درد تو دردِ دل کو نوعِ انسانی کی تخلیق کا واحد مقصد بتاتے ہیں:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

اب رہی "رجائے مومن"! سو یہ کوئی مروجہ اصطلاح نہیں ہے، بلکہ ایک ترکیب ہے جو ادائے مطلب کے لیے میں نے گھڑ لی ہے۔ یہ ایک مسلّم امر ہے کہ سچے مومن کو بد تر سے بدتر حالات اور تاریک سے تاریک لمحات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تقنطوا من رحمۃ اللہ فرمانِ الٰہی ہے جس پر سب مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور ایک حد تک عمل بھی کرتے ہیں مگر کڑے امتحان کا وقت آجائے، تو بہت کم اس میں پورے اترتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد جو بات کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ رشید و مرشد میں یہ دونوں صفات بڑی حد تک مشترک تھیں اور ان میں مضبوط رشتۂ اتحاد کا کام دیتی تھیں۔ ذاکر صاحب کی ملک گیر بلکہ عالمگیر ہمدردی اور غمخواری، حاجت روائی اور فیض رسانی تو چشمۂ آفتاب کی طرح روشن تھی اور سوائے شپرہ چشم حاسدوں کے سارے زمانے کو نظر آتی تھی۔ مگر علی گڑھ برادری جو سارے برصغیر ہند میں اور بہت سے بیرونی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے، جانتی اور مانتی ہے کہ رشید صاحب میں بھی یہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ہر چند ان کا دائرۂ عمل مقابلتاً محدود ہے، مگر امورِ خیر میں کمیت کے فرق سے کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح "رجائے مومن" کے معاملے میں بھی رشید و مرشد کو ایک دوسرے کا جواب سمجھنا چاہیے۔ کم سے کم میں نے دونوں میں سے کسی کو سخت سے سخت ذاتی ابتلا یا قومی بحران کے موقع پر بھی مایوسی کے عالم میں نہیں پایا۔

اب یہ بات صاف ہوگئی ہوگی کہ علی گڑھ کے ماضی کے بارے میں شدید اختلاف کے باوجود ذاکر صاحب اور رشید صاحب اس کے حال سے یکساں فکرمند اور دلگیر تھے، مگر مستقبل سے قطعاً مایوس نہ تھے۔ مدعی لاکھ کہے

زمینِ شورہ سنبل بر نیارد
درو تخمِ عمل ضائع مگرداں

مگر "رجائے مومن" کا جو دونوں کے دلوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی، یہ تقاضا تھا کہ خدا پر بھروسا رکھو، فطرتِ انسانی کی بنیادی اچھائی پر بھروسا رکھو، اور نہضت و ترقی کی راہ

صلاحیتوں پر بھروسا رکھو، جو علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا، بلکہ کل ہندستانی مسلمانوں میں بالقوۃ موجود ہیں۔ اور اپنی سعی کوشش کرتے رہو کہ یہ صلاحیتیں قوت سے فعل میں آجائیں۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس امر کی شہادت دیتا ہوں، جس سے کم لوگ واقف ہیں، کہ ذاکر صاحب اس زمانے میں بھی جب وہ بہت سے مسلمانوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنے ہوئے تھے، عام طور پر مسلمانوں اور خاص کر اپنے محبوب ادارے مسلم یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ہر امکانی کوشش کرتے رہے اور ان کی شخصیت سر سید مرحوم کی طرح حالی کے اس شعر کی پوری مصداق تھی:

جور اخوان دیدن و در عشق اخواں زیستن
زخم پیکاں خوردن و مشتاق پیکاں زیستن

رہے رشید صاحب، تو ہر شخص جو آنکھیں رکھتا ہے، اور ان سے کام بھی لیتا ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ وہ ضعف پیری کے باوجود، ہمیشہ کی طرح اب بھی زبان و قلم سے علی گڑھ کی حمایت، بزرگانہ تنقید، اور اصلاح میں سرگرم ہیں اور یقین ہے کہ زندگی بھر رہینگے۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے!

آخر میں یہ بھی کہہ دوں، کہ رشید و مرشد دونوں "درد دل" کی بدولت تقسیم ہند کے بعد، مدتوں قلب میں ملول و افسردہ رہے۔ مگر "رجائے مومن" کی برکت سے ان کی خلقی زندہ دلی کم و بیش بدستور قائم رہی، اور ان کی تحریر و تقریر میں عام طور پر لوگوں کو شگفتہ دلی اور خوش طبعی نظر آتی رہی۔ صرف معدودے چند جو گہری ادبی اور نفسیاتی بصیرت رکھتے ہیں، اس راز کو پا سکے کہ دونوں درد دل کے "شورش باطن" کو "رجائے مومن" کی قوت سے دباتے رہے ہیں۔ اور ان کا

دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

رشید احمد صدیقی

تاج محل کی شہرت اتنی ہے کہ اکثر پہلی دفعہ دیکھنے پر انسان کو کچھ مایوسی سی ہوتی ہے۔ آدمی جو خواب دیکھتا ہے، وہ حقیقت بن جائے تو اس کی طلسمی فضا کچھ مدھم سی معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال رشید صاحب کا ہے۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کے مضامین مزے لے لے کر پڑھے ہیں اور "ارہر کا کھیت"، "گل منزل"، "شیطان کی آنت"، "ماتم"، "مرشد" یا "مولانا سہیل" پر وجد کر چکے ہیں، ان کے ذہن میں رشید صاحب کی شخصیت کا جو نقش بنتا ہے، وہ اصل سے بالکل مختلف ہے۔ آپ ایک باغ و بہار آدمی کی تلاش میں ہیں، اور آپ کو دوچار ہونا پڑتا ہے ایک خزاں رسیدہ ہستی سے۔ پطرس بخاری اور رشید صاحب کی شخصیت میں وہی فرق ہے جو ان کے فن میں ہے۔ بخاری ایک شوخ اور زندہ دل انسان ہیں، رشید صاحب ایک ناکام عاشق کی زندہ تصویر ہیں۔ بخاری کی شخصیت ایک پھلجھڑی کی طرح ہے، تھوڑی دیر کے لیے فضا رنگ و نور سے معمور ہو جاتی ہے، اور پھر وہی اندھیرا۔ رشید صاحب کی لَو اتنی مدھم ہے، کہ اس سے اوّل اوّل اندھیرے کا احساس کچھ بڑھ جاتا ہے، مگر رفتہ رفتہ ہم اندھیرے سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے ٹھیک کہا تھا کہ رشید صاحب صورت سے مزاح نگار تو نہیں البتہ مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کی شخصیت کا

حسن اُن کے فن کی طرح کچھ دیا مٹا چا ہتا ہے ۔ وہ اپنی چنگاری کو چھپانے میں کامیاب ہیں ۔

رشید صاحب ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے ۔ وہ جونپور کے ایک قصبے "مریاہو" کے رہنے والے ہیں ۔ پورب دیس کے قصبے بڑے مردم خیز ہیں ۔ ان میں صدیوں تک قدیم علم و ادب کی شمع روشن رہی ہے ۔ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے مشرقی اضلاع کے مذہبی و علمی اداروں کا ذکر کیا ہے جو ایک محدود پیمانے پر مگر مسلسل علم کی لگن اور اخلاق و شرافت کے جوہر عام کرتے رہے ۔ رشید صاحب کو اپنے گھریلو ماحول سے یہ سب کچھ ملا ۔ پھر قصباتی زندگی سے انھیں دیہاتی زبان ، وہاں کی فضا انسانیت کا ایک کھردرا ، مگر خاصا پائدار تصور ملا ۔ ہائی اسکول کے بعد وہ علی گڑھ آ گئے ، مگر مالی حالات نے انھیں تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور کیا ۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں کبھی ڈیوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ بڑے بڑے آدمیوں سے ملتے ، اور کبھی کچہریوں کی معروف اور میلی فضا میں بدخط افسروں کے فیصلوں کی نقل کرتے ۔ رشید صاحب اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے ہیں ۔ انگریزی میں ایسے آدمی کو SELF MADE کہتے ہیں ۔ انھوں نے ہر قسم کے لوگوں کو دیکھا اور برتا ہے ۔ زندگی کے کتنے ہی نشیب و فراز ، دیوتاؤں کے کتنے ہی مٹی کے پاؤں اور پجاریوں میں دیوتاؤں کی کتنی ہی ادائیں پائی جاتی ہیں ۔ وہ اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے ، جب علی گڑھ ایک طرف شائستگی اور علم طلبی کے لیے مشہور تھا ، اور دوسری طرف "پیر ومغاں کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہونے والا تھا" ۔ ۱۹۱۵ء میں مسٹر ٹول کالج کے پرنسپل تھے ۔ اس زمانے میں ترک ، ہندستانی مسلمانوں کے ہیرو تھے اور رشید صاحب کے کئی ساتھیوں نے قومی زندگی میں اسی وقت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا ، مگر رشید صاحب نہ غازی بنے ، نہ شہید ہوئے ، وہ زندگی کے ایک خاموش تماشائی رہے ہیں ۔ اور شاید اسی ذوق تماشا ہی نے اردو ادب کو

ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک نکتہ سنج ادیب، ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار اور طنز نگار دیا۔ زندگی کی بعض محرومیں، ادب کی کامرانیاں بھی ہوتی ہیں۔
بی، اے کرنے کے بعد رشید صاحب نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم، اے کیا۔ طالبعلمی کے دوران میں یونین کے سکریٹری بھی رہے، اور اس زمانے میں انھوں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھنا شروع کیے۔ ان مضامین میں ولایت علی بمبوق کا ہلکا سا پرتو ہے، مگر بہت جلد رشید صاحب نے اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم کرلیا علی گڑھ منتھلی کا، جو بعد میں علی گڑھ میگزین کہلایا) اس زمانے میں اردو کے موقر رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ رشید صاحب عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ انھیں ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین) مولانا سہیل (اقبال احمد) نور اللہ جیسے ممتاز ساتھی ملے، اور اردو ادب میں ایسے نثر نگار کم ہیں، جو زمانہ طالبعلمی ہی میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہوں۔ ان میں رشید صاحب کا نام ممتاز ہے۔ عظمت اللہ خاں اور سجّاد انصاری جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، رشید صاحب کا جوہر پہلے پہچاننے میں مشترک ہیں۔

۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں ایک بہت بڑا ذہنی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب بہت سوں کو بہا لے گیا اور اس کی موجوں نے ہماری ادبی اور علمی زندگی میں کتنے ہی طوفان پیدا کیے، مگر رشید صاحب پر بظاہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے قوم پر اپنی زندگیاں قربان کردیں، رشید صاحب نے انھیں بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا، مگر خود انھوں نے کوئی قربانی یا ایثار اس قسم کا کبھی نہیں کیا۔ وہ کبھی ہیرو نہ بن سکے، نہ انھوں نے بڑے بڑے اصول اپنی زندگی میں بنائے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے ووٹ ہمیشہ اپنے دوست کو دیا۔ انھوں نے اصول پرستی کے خطروں کو دیکھ لیا تھا، انھیں خیالات یا تصورات سے زیادہ انسانوں سے دلچسپی رہی۔ ہاں انھوں نے ہر تصور کی آب و تاب، اس کی گرمی اور روشنی، اس کی بلندی یا پستی کو دیکھنے کی کوشش

کی۔ انھیں ادب ایک "پناہ گاہ" کی شکل میں نظر آیا۔ سعدی اور حافظ، غالب اور اقبال، شبلی اور اکبر، گوئٹے اور ملٹن، برناڈ شا اور رو کرڈ ہوگیو کی تصانیف سے انھوں نے انسانوں کے متعلق ایک بصیرت بھی حاصل کی اور انھیں ایک پاکیزہ ادبی ذوق بھی ملا۔ ان کے مضامین اسی وجہ سے مسرت اور بصیرت کے خزانے ہیں۔

رشید صاحب اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے تھے، جب وہاں کی اقامتی زندگی بڑی رنگینی اور کشش رکھتی تھی۔ وہ اس کے جادو کا شکار ہو گئے۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی، کہ اس کے بعد کوئی اور حسن ان کی نظر میں نہ جچا۔ رشید صاحب مصلح ہیں نہ امیر قوم، وہ صرف معلم بھی نہیں ہیں۔ وہ دراصل ایک عاشق ہیں۔ انھوں نے ایک فرد سے نہیں، بلکہ ایک ادارے اور ایک انجمن سے عشق کیا ہے، اور اسی انجمن کو خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب علی گڑھ سے باہر نہ گئے ہوں۔ انھوں نے پہاڑوں کی سیر بھی کی ہے، اور ہندستان کے میدانوں کی بھی۔ وہ برما تک ہو آئے ہیں اور میرا ان کا جنوبی ہند کے ایک سفر میں بھی ساتھ رہا۔ مگر دراصل ہر جگہ وہ اپنی علی گڑھ والی عینک پہنے رہے۔ وہ کسی انسان کے پیچھے چلتے ہیں، نہ کسی تصور کے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص یا خیال کسی نہ کسی طرح ان کے حرم میں داخل ہو ہی جائے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں، جس میں جلال بھی ہے اور جمود بھی۔ ان کے خیالات میں کوئی بڑا انقلاب نہ ملیگا۔ ہاں ایک مدھم سا ارتقا ضرور ہے۔ ان کی شرافت نے انھیں بعض اہلِ غرض کا شکار بھی بنایا۔ انھوں نے دوستی کو ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ انھیں دوسرے کی مطلب پرستی سے سروکار نہیں، اپنی دوستی سے غرض ہے۔ وہ اپنی ہر ضرورت کو دوستوں کی معمولی سی مصلحت پر قربان کر سکتے ہیں۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں، اسے بہت کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انھوں نے جس طرح زندگی میں برت کر دکھایا

ہے، کم کسی نے دکھایا ہوگا۔ گو وہ اس راز سے بےخبر ہیں کہ یہ چیزیں بھی مطلق نہیں، اضافی ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں مشرقیت بعض اوقات قدامت پرستی کی شکل میں، شرافت کمزوری کے روپ میں، معقولیت مصلحت کے قالب میں اور انسانیت سستی رواداری کے لباس میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی عزت اور محبت کیے بغیر چارہ نہیں۔

رشید صاحب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں شروع شروع میں صرف بی۔ اے میں لازمی اُردو تھی۔ رشید صاحب کو طالبعلمی میں ٹینس کا شوق تھا۔ اس شوق کو وہ درد گردہ کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ ان کا کھیل سلیم کی سلامت روی اور مستقل مزاجی کا مظہر تھا۔ لازمی بی۔ اے کا کورس کچھ زیادہ نہ تھا۔ اسی لیے ایک عرصے تک رشید صاحب آبِ حیات اور دیوانِ غالب اور جدید شعرا کے کچھ انتخابات پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ اُردو میں کوئی فیل ہو۔ اُردو تو ان کے لیے ایک NECESSARY EVIL سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ایف۔ اے اور بی۔ اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اُردو شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اُردو کے ریڈر ہوئے۔ ان کا انتخاب علامہ اقبال نے کیا تھا۔ پھر وہ پروفیسر بنا دیے گئے۔ علی گڑھ میں اُردو کی تدریس کی اہمیت صحیح معنی میں ڈاکٹر صاحب کے دور سے شروع ہوئی۔

رشید صاحب کی جوانی درد گردہ کے پیہم حملوں میں گزری۔ ان کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک گردہ کی تکلیف نے انھیں بہت پریشان کیا۔ ڈاکٹر بھاٹیا نے بالآخر ایک کامیاب آپریشن کر کے ایک گُردے کو بالکل "آں جہانی" کر دیا۔ ان کا مضمون "شیطان کی آنت" اسی ظلمات کا آبِ حیات ہے۔ رشید صاحب نے عشق کیا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے، مگر وہ اس معاملے میں میر کے اس مسلک پر عامل رہے ہیں۔

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

رشید صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اُردو اور فارسی کے کلاسیکی سرمایے پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے، بلکہ ان سے اثر بھی قبول کیا ہے۔ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، اور بڑی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر وہ کتابوں کے کیڑے نہیں ہیں۔ ان کے پاس ہر سال بہت سی کتابیں آتی ہیں، مگر رہتی نہیں، دوست احباب لے جاتے ہیں۔ باقاعدہ مطالعے کے وہ عادی نہیں۔ انھوں نے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ انھیں مہدی افادی کی "نازنینانِ حرم" سے دل بہلانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مگر وہ کسی بھی اہم مضمون یا کتاب کا تذکرہ سنتے ہیں، تو اُسے غور سے پڑھتے ہیں۔ اور پھر ان کی رائے تقلیدی نہیں، بلکہ اوریجنل ہوتی ہے۔ ان کا ادبی ذوق پاکیزہ ہوتے ہوئے قدرے پرانا ہے۔ اور گو نئے خیالات سے انھیں خدا واسطے کا بیر تو نہیں، مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے۔ وہ اسالیبِ فن میں رچاؤ اور زبان میں پختگی اور ہمواری ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ادب کے ایک اخلاقی تصوّر کو مانتے ہیں۔ اس کی مقصدیت پر بھی انھیں اعتراض نہیں ہے، مگر وہ بے محابا تجلّی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں۔ غزل کو وہ "اُردو شاعری کی آبرو" سمجھتے ہیں۔ مگر اس میں ہماری بے آبروئی کا جو سامان ہے، اس سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ اچھی نظم پر وجد بھی کرتے ہیں، مگر جو "ابتہاج و اہتزاز" (یہ انھی کے الفاظ ہیں) انھیں غزل کے اشعار سے ملتا ہے، وہ نظم سے نہیں۔ غالب کے اشعار سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے۔ یہ غالب کی عظمت کی دلیل ہو یا نہ ہو، رشید صاحب کے عرفان کا ثبوت ضرور ہے۔ جدید دور میں اچھے شعر کا برمحل استعمال یا اس کے چراغ سے چراغ جلانا کم ہوگیا ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر ہمارے کلاسیکی سرمایے پر اتنی گہری نہیں رہی ہے۔ رشید صاحب ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں، جو شعر پڑھیں اور جان بحق تسلیم ہو جائیں۔ انھوں

نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ بعض اوقات پڑھنے میں شعر کو نثر بنا دیتے ہیں، لو اچھا خاصا موزوں شعر ناموزوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر وہ شعر کے جادو سے واقف ہیں اور اس کا جادو جگانے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ غالب، اقبال، حسرت، اصغر اور جگر کے بڑے قائل ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین میں ترتیب و تنظیم کی کمی کا متعدد اشخاص نے ذکر کیا ہے۔ یہ بات ان کی زندگی میں بھی ہے۔ وہ اپنی صبح کا مصرف جانتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں؛ انھیں گلاب سے عشق ہے۔ مگر ان کی شامیں اکثر دوستوں کے مجمعوں یا برج کی میز کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی صلاحیت کو دوستوں کی فرمائشوں پر بھی برباد کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے پروپیگنڈے، الیکشن کے لیے مینی فیسٹو، یونیورسٹی کے معزز مہمانوں کے لیے سپاسنامے، سبھی کچھ لکھتے رہے؛ مگر انھوں نے روزمرہ کی زندگی کو اتنا دلچسپ، اتنا نشہ آور، اتنا پُرسحر اور پُرکیف پایا ہے، کہ ادب کا جادو بھی انھیں پوری طرح اپنا اسیر نہ کر سکا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتے ہیں، تو اس کے خیالات سے مستفید ہونے کے لیے اتنا نہیں، جتنا اپنے خیالات کو ترتیب دینے کے لیے۔ دوسروں کی چنگاری صرف ان کی چنگاری کو ہوا دیتی ہے۔ مگر مضامین میں ترتیب و تنظیم کی بظاہر جو کمی ہے، اس کا ایک جواز بھی ہے۔ اس کی ایک ادا تنظیم ہے، جو عام ترتیب سے زیادہ آزاد اور بے پروا، مگر اپنی جگہ پر پُراثر اور مکمل ہے۔ یعنی رشید صاحب کی زندگی ایک کتاب سے دوسری کتاب تک نہیں ہے، بلکہ یہ کتابیں ان کی شخصیت کے سمندر کا ایک چھین ہے۔ رشید صاحب کی کوئی کتاب باقاعدہ تحقیق یا تلاش کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہر کتاب میں بڑے پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ "طنزیات و مضحکات" ایک طرح آبِ حیات کی یاد دلاتی ہے۔ آبِ حیات کی ہر بات غلط ثابت ہو سکتی ہے مگر آبِ حیات سے کوئی ادب کا طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طنز و ظرافت کے موضوع پر اس سرسری نظر میں بھی ایسے گہرے

اور بصیرت افروز تاثرات ملتے ہیں کہ ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ یہی حال "زبانِ اردو پر ایک نظر" کا ہے۔ جو در اصل ان کے ایک لیکچر کا عنوان ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ نہیں ہے، لیکن اس کے مزاج کا ایک حیرت انگیز احساس ہے۔ وہ بعض چونکانے والے فقرے لکھتے ہیں جن میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے مثلاً "حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں" یا مثلاً ان کا یہ جملہ کہ "کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو"۔ مگر ان میں حقیقت کی جو کرن ہے، وہ بھی کم نظر فریب نہیں ہے۔

رشید صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں، مگر در اصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشاء پرداز کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال، اکبر، عبدالرحمٰن بجنوری، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں وزن سے زیادہ وقار ہے۔ مگر یہ وقار یونہی نہیں آیا ہے۔ اس میں زندگی اور ادب کا قدرے پرانا سہی، مگر پھر بھی ایک سنجیدہ اور پاکیزہ شعور ملتا ہے۔ وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے؛ مگر جن پہلوؤں پر اُن کی نظر ہے، وہ پہلو سطحی اور سستے نہیں، قابلِ قدر بلکہ قابلِ غور ہیں۔ وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے، مگر انھوں نے کسی گھٹیا یا مصنوعی یا نمائشی پہلو کی کبھی داد نہیں دی۔ ان کی تنقیدیں ڈاکٹر جانسن کی یاد دلاتی ہیں۔ یا تو یہ تاثرات ہیں، یا فیصلے؛ مگر ان کے پیچھے ایک رچا ہوا اور پختہ شعور ضرور ملتا ہے...

مگر رشید صاحب کا بڑا کارنامہ مضامینِ رشید، خنداں، گنج ہائے گرانمایہ اور ذاکر صاحب، ہمنفسانِ رفتہ ہیں۔ پہلی دو کتابیں ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ موخر الذکر تینوں کتابوں میں شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ گنج ہائے گرانمایہ اور ہمنفسانِ رفتہ اشخاص کا تذکرہ ہے، جو اپنی موت کے باوجود زندہ اور روشن ہیں۔ اور ذاکر صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کی پرسوز اور دلربا شخصیت کا خاکہ ہے۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کا یہ

توقع نہیں، اور نہ چند سطروں میں اس کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صرف "خوانِ مسرت" نہیں "سامانِ بصیرت" بھی ہے۔ یہ ہنسی کا پشتارہ نہیں ہے، تبسم کا خزانہ ہے۔ رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، بلکہ سوچنے کے لیے بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ رعایت لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز پر لطیف تبصرے ہیں۔ ان میں کتنے ہی انسانوں کی کمزوریوں کا حسن، اور کتنے ہی معمولی آدمیوں کی بڑی اور قابلِ قدر باتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ قصے بھی سناتے ہیں؛ قولِ محال سے بھی کام لیتے ہیں؛ جاندار اور خیال انگیز تشبیہات کے چمن بھی آراستہ کرتے ہیں؛ اور اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک سدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں۔ مگر زندگی کی وہ قدریں جن پر ان کا ایمان ہے "گنج ہائے گراں مایہ" میں اشاروں کے بجائے داستان بن کر آئی ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا حسن جو ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے مزاحیہ مضامین میں بعض اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ گنج ہائے گراں مایہ میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کی یاد کے سہارے نکھر کر ایک اور آب و تاب سے آیا ہے۔ محمد علی، اقبال اور اصغر پر ان کے جو مضامین ہیں، ان کی خوبی میں کلام نہیں، مگر اس مجموعے کی جان مولانا سلیمان اشرف اور آفتاب مرحوم ہیں۔ یہاں سرِ دلبراں حدیثِ دیگراں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی شخصیت میں علم کی دنیا شان ہے۔ مگر آفتاب میں خدمت کا حسن ہے۔ رشید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جلال و جمال دونوں کو دیکھ سکتے ہیں، اور دکھا سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب پر رشید صاحب کی چھوٹی سی کتاب ممدوح کی شخصیت کی جامع تصویر نہیں ہے، مگر پھر بھی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں اقبال کے "مردِ مومن" کا سا جادو ہے اور ان کے ایک شعر

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

کی تفسیر ملتی ہے۔ پھر بھی یہ ایک عاشق کا کارنامہ ہو، ایک عارف کا نہیں۔
رشید صاحب کی باتیں بڑی پُرلطف ہوتی ہیں، مگر ہر ایک کے لیے نہیں ہوتیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، جنھیں اپنی طلاقت لسانی پر بڑا ناز ہے۔ ایسے لوگوں کے یہاں ایک پوز (POSE) ضرور ہوتا ہے جو رشید صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ وہ شرمیلے آدمی ہیں۔ مجمعوں سے گھبراتے ہیں۔ مداحوں سے دور بھاگتے ہیں۔ وضعداری سے انھیں نفرت ہے، مگر بے تکلف دوستوں کے مجمعوں میں وہ ایک بلبل ہزار داستان ہیں، اس "پیمانۂ صہبا" کے بغیر وہ گل افشانیٔ گفتار پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مگر ان کی باتوں سے زیادہ ان کے خط دلچسپ ہوتے ہیں۔ اکبر سے وہ بہت متاثر ہیں، اور اکبر کی طرح انھیں بھی بہت سی مصلحتوں کا خیال رہتا ہے۔ مگر وہ اپنے دوستوں کو جو خط لکھتے ہیں، ان میں بےتکلف مختلف اشخاص یا واقعات پر بڑے پُرلطف تبصرے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا سب سے بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے، نہ قلمی مرقعوں میں، نہ تنقیدوں میں، نہ دوسرے مضامین میں، بلکہ ان کے خطوں میں ہے۔ اصغر مرحوم نے ان کے وہ سب خط محفوظ کر رکھے تھے، جو ان کو لکھے گئے تھے۔ مگر رشید صاحب نے ان کے مرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ خط ان کی بیوی سے لے کر جلا دیے۔ وہ ادب کے تقاضوں سے زیادہ زندگی کی مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ میرے پاس ان کے کئی سو خط ہونگے، اور میں ان کو شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں، مگر ابھی تک سب سے بڑا مرحلہ رشید صاحب کی منظوری کا ہے۔ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے۔ "خطوط سے میں نے بڑے بڑے کام نکالے ہیں، روٹھے ہوئے دوستوں کو راضی کرنے میں، "ڈیولی سوسائٹی" کے لیے چندے حاصل کرنے میں، کسی عالم کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کے لیے مالی دشواریوں کو دور کرنے میں، اپنا غم غلط کرنے کے لیے، دوستوں کے رنج و راحت میں شریک ہونے کے لیے اور مذہب، سیاست، جنس، عورت اور عطریات، ڈاکٹر ضیاالدین اور مولانا عبدالماجد،

کانگریس اور مسلم لیگ، ہندستان اور پاکستان، گھریلو زندگی کے قہر و مہر اور احباب کے جلسوں کے لطف و انبساط، ان سب بولتے ہوئے طرح کے مصرعوں پر رشید صاحب نے ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ جب وہ شائع ہونگے، تو غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایے میں سب سے بڑا اضافہ ہونگے۔

رشید صاحب کو قابلِ دید مقامات سے کوئی دلچسپی نہیں، سفر میں وہ ضروری کام کر کے پہلی گاڑی سے گھر واپس آجاتے ہیں۔ وہ نئے واقعات کے ہیجان کے مقابلے میں مانوس راحتوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے دو محبوب مشغلے ہیں: ایک برج کھیلنا، دوسرے خریداری کرنا۔ ان دونوں چیزوں میں وہ فن برائے فن کے قائل ہیں، یعنی خریداری میں چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا اور برج میں مسلسل ہارنا، ان کے لیے یکساں نشاط کا باعث ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نہ اچھا برج کھیلتے ہیں، اور نہ خریداری میں ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے لیے نفع بخش نہیں، موجبِ نشاط ہیں۔ وہ دعوتیں کرنے کے بڑے شائق ہیں۔ ان کی بیوی بڑا اچھا کھانا پکاتی ہیں اور وہ بڑے لطف سے دوستوں کو کھلاتے ہیں۔ اپنے لباس کے معاملے میں بہت بے پروا ہیں، مگر جامہ زیب اور خوش پوش اشخاص کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کسی اچھے آدمی سے ملتے ہیں یا کوئی خوشی کی بات سنتے ہیں، تو دوستوں کو ضرور اس خوشی میں شریک کر لیتے ہیں، مگر اپنی تکلیف اور دکھ کا بار خود ہی مردانہ وار اٹھا لیتے ہیں، دوسروں کو یہاں تک کہ بیوی بچوں کو بھی اس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ سب کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، مگر کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔

ایک دفعہ وہ اور میں نواب چھتاری کے مہمان تھے۔ نواب صاحب اس زمانے میں حیدرآباد کے صدرِ اعظم تھے۔ حیدرآباد میں ایک اردو کانفرنس تھی۔ ہم لوگ شاہ منزل میں ٹھہرائے گئے۔ ہر طرف آداب و تسلیمات، سکریٹری، کلرک، چپراسی ہر اشارے پر موجود۔ نواب صاحب بہت مہربان۔ وہ سراپا تیسرا دن تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد میں کچھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ رشید صاحب بھی چپ تھے۔

کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "کیوں بھئی، یہ آج آپ مہاتما بدھ کی طرح سوچ میں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا: "سوچ رہا ہوں، بڑے پھنسے ہیں۔ ہم لوگ ٹھہرے چھ چھ پیسے والے آدمی، مگر اب تو شوکیس میں سجا دیے گئے ہیں۔ چھ پیسے والے مال کو وہائٹ وے میں رکھ دیا جائے تو کیا ہو؟" رشید صاحب کے چہرے پر جیسے نور دوڑ گیا۔ کہنے لگے "میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ مگر حبسِ دم کیے ہوئے تھا۔ دیکھ رہا تھا، پہلے کون ہار مانتا ہے۔" اور اس کے بعد ہم لوگ جلسے سے جلد وہاں سے بھاگے اور مجھ سے زیادہ رشید صاحب خوش تھے۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر شوفر کو ٹپ کر کے ہم لوگوں نے ٹی اسٹال پر دو آنے پیالی والی چائے پی — مونگ پھلی والے سے مونگ پھلی خریدی۔ میں نے اخبار لیا۔ رشید صاحب نے اپنا بیگ کھول کر پاندان نکالا۔ پان بنایا اور پیک کو منہ میں تول کر بولے: "سرور صاحب! اب جان میں جان آئی ہے۔ یہ سرکاری درباری لوگ، نہ جانے کیسے اس قدر باقاعدہ اور مہذب زندگی بسر کر لیتے ہیں؟" میں نے کہا "رشید صاحب، برنارڈ شا نے کہا ہے" بات کاٹ کر بولے: "دیکھیے حضرت، یہ شکسپیر یا شا کی بات اب علی گڑھ تک نہ ہوگی" میں نے کہا: "اچھا، اقبال کے اشعار پڑھنے کی اجازت ہے؟" کہنے لگے "ہاں، اس میں مضائقہ نہیں"۔

ایک دفعہ ہم دونوں نے جنوبی ہند پر پہلا اور غالباً آخری حملہ کیا، یعنی میسور گئے۔ دہلی سے ساتھ سفر طے ہوا تھا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھا کہ یونیورسٹی والے ہوائی جہاز کا کرایہ دینے پر رضامند ہیں، کیوں نہ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلیں، اس لو میں مرنے سے بچ جائینگے۔ رشید صاحب کا جواب آیا کہ "ہوائی جہاز سے سفر نہیں ہوگا۔ سکنڈ کلاس میں چلینگے۔ ہو سکا تو میسور سے ساڑی اور وہاں کی مصنوعات خریدینگے، اور کچھ بچا لائینگے۔ آج کل فضول خرچی قومی جرم ہے" غرض میں لو میں مرنے کے لیے راضی ہو گیا کہ رشید صاحب ٹھکانے سے دفن کرا دینگے اور پھر عمر بھر کے لیے بال بچوں کے خرچ کے کفیل بھی ہو جائینگے۔ دہلی صبح پہنچا۔ دوپہر کو چلچلاتی دھوپ

میں رشید صاحب آئے۔ شام کو ساڑھے چار بجے جب ٹمپریچر کم از کم ۱۱۵ درجہ ہوگا، ہم لوگ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں بیٹھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے تھے، اس لیے فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ رشید صاحب کے ساتھ ناشتے کا بہت سا سامان تھا اور پانوں سے بھرا ہوا پاندان تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک صراحی تھی۔ راستہ باوجود گرمی کے بڑے لطف سے کٹا۔ میں نے مدراس سے گھر خیریت کا تار دیا۔ رشید صاحب نے بھی میری ضد میں تار دیا۔ بنگلور پہنچے، تو بڑا حسین موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بارش، لطیف خنکی اور بڑا دُھلا منجھا شہر۔ یونیورسٹی پہنچے، اُردو کے پروفیسر کے تقرر کا مسئلہ تھا۔ رشید صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "حضرت! اُمیدواروں سے سوالات وغیرہ آپ ہی کیجیے گا۔ آپ کے فیصلے کی میں تائید کروں گا۔" بنگلور سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک شاگرد کے ہمراہ میسور گئے۔ مجھے ٹیپو کے مزار اور دریائے کاویری کے دیکھنے کا اشتیاق تھا، وندراون کے باغ کی سیر کا بھی ارمان تھا۔ شاگرد نے ازراہِ عقیدت میسور کے سب سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ وہاں کے ٹھاٹھ دیکھ کر ہم لوگ چوبیس گھنٹے میں گھبرا گئے۔ آخر اپنے شاگرد کے ایک دوست کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بڑے اچھے ذوق کے آدمی ہیں اور میسور کے سربرآوردہ مسلمانوں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اُردو ادب دونوں سے گہرا شغف ہے؛ رشید صاحب کے اسلوبِ بیان کے دلدادہ اور ان کے غائبانہ عاشق۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ اوٹی چلے۔ رشید صاحب بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ حسبِ عادت جلد سے جلد گھر جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا کہ اس پروگرام میں صرف دو دن خرچ ہوں گے۔ مگر چار دن لگ گئے، ــــــ اوٹی پہنچے تو رشید صاحب عورتوں کی طرح خفا ہو گئے۔ اب نہ بات کرتے ہیں، نہ کمرے سے نکلتے ہیں۔ خفگی یہ تھی، کہ میں نے کیوں سر ڈال دی اور کیوں پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ میں نے کہا "رشید صاحب، اتنی دور آ کر بھی جنوبی ہند کے نظاروں سے محروم رہ جانا بدمذاقی ہے، اور ایسے اچھے میزبانوں اور ساتھیوں کی موجودگی میں منہ پُھلا کر بیٹھ جانا آپ کو

ہرگز زیب نہیں دیتا؟ خیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ دوسرے دن ہی واپس ہو نگے۔ میسور پہنچے تو خریداری شروع کی۔ واپسی میں مدراس پر حساب لگایا، تو معلوم ہوا، کہ تقریباً پانچ سو روپے کرایے کے ملے تھے۔ رشید صاحب سوا پانچ سو خرچ کر چکے تھے، اور میرے پاس پچاس ساٹھ بچ رہے تھے۔

رشید صاحب لڑنے والے آدمی نہیں، کوئی زیادتی کرے، تو کڑھتے ہیں، جھگڑتے نہیں۔ اصولی بات ہوری ہو تو وہ مصلحت اور عافیت کا سہارا لیتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا معرکہ مجھے یاد ہے۔ میری سفارش پر سجاد انصاری کی کتاب "محشر خیال" ایم، اے کے نصاب میں داخل کی گئی تھی۔ سجاد انصاری کی انشاپردازی کے رشید صاحب بھی قائل تھے۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر پڑ گئی، جنھیں ہر "عنانی خیال" کو "گناہ" ٹھہرانے میں ذرا بھی پیش و پس نہیں ہوتا۔ انھوں نے رشید صاحب کو خط لکھا، کہ "یہ کتاب جس میں خدا اور مذہب سے شوخیاں ہیں، ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہیے"۔ رشید صاحب نے مولانا کا خط مجھے دکھادیا اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے پھر "صدق" میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ہم لوگ پی گئے۔ آخر انھوں نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ مولانا صدر یار جنگ حبیب الرحمن خان شیروانی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ یوں بھی یونیورسٹی میں ان کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ انھوں نے مولانا عبدالماجد کی تحریک پر وائس چانسلر ابوبکر احمد حلیم صاحب کو ضابطے کا خط لکھا اور اس کتاب کے خارج کیے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب نے شعبۂ اُردو کا جلسہ بلایا اور یہ مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے۔ میں نے احتجاج کیا کہ شعبہ صرف ادبی اہمیت کو دیکھتا ہے۔ اگر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نصاب کی کوئی کتاب خارج کرنی ہے، تو اکڈمک کونسل کو کرنا چاہیے۔ نصاب میں اہم اور نمایندہ اسالیب اور پہلو لیے جاتے ہیں؛ ان کے پڑھانے اور اور ماننے میں فرق ہے۔ خلسفے اور سیاست کے نصاب میں بھی ہم مفکر اور مصنف

نظریات پڑھاتے ہیں۔ یہ آزادیٔ فکر یونیورسٹی کی خصوصیت ہے۔ اس لیے شعبہ اس کتاب کو خارج نہیں کر سکتا۔ خلافِ توقع رشید صاحب نے فوراً سپر ڈال دی۔ کہنے لگے "سرور صاحب! جب کتاب رکھ نہیں سکتے تو پھر جانے دیجیے۔" میں نے کہا: "حضرت! یہ لوگ ہم سے کیوں نکلوانا چاہتے ہیں۔ خود یہ جرأت کیوں نہیں کرتے کہ اپنے مصالح کی بنا پر اکزکٹو کونسل میں قرارداد پاس کریں۔" مگر رشید صاحب نہ مانے، مجھے ہی ماننا پڑا۔

رشید صاحب یوں تو اصولوں کے چکر میں نہیں پڑتے، مگر جہاں شعبے کی عزت کا سوال آتا ہے، وہاں وہ ضرور سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے نظام حیدرآباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجیے گا پسند نہ آئیگا۔" بولے "کیوں؟" میں نے کہا: "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ؛ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئیگا۔" یہی ہوا ــــ ایڈریس سن کر کہنے لگے "کچھ جچا نہیں، پھر کوشش کیجیے۔" رشید صاحب نے نظرِ ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندوستان کو تین تحفے دیے: تاج محل، غالب اور دولتِ آصفیہ۔" اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدرآباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کاٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن سی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجیے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر ایسے شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" جب رشید صاحب نے یہ سنا، تو کمال کر دیا۔ ایک صاحب کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے گئے کہ "میں نے یہ الفاظ سنے ہیں، کیا آپ نے کہے تھے؟" ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کس عالم میں تھے۔ انھوں نے پھر خفگی ظاہر کی، اور اقرار کیا۔ اس پر رشید صاحب کہنے لگے کہ "آپ

مجھے جو چاہیں، کہ لیں، لیکن شعبے کے متعلق اس قسم کے الفاظ میں نہیں سن سکتا۔ اس کے بعد سے آخر تک رشید صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو معاف نہ کیا۔ عرصے تک تو بات ہی نہ ہوتی تھی، پھر رسمی مراسم ہو گئے تھے، مگر دل صاف نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے بھی ایک دفعہ نہ معلوم، کس ترنگ میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید صاحب، مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر شعبے پر بے موقع اعتراضات سے انھیں بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے مولوی صاحب سے بات چیت ترک کر دی۔ مولوی صاحب کو لوگوں نے بھڑکا یا تھا، وہ خواہ مخواہ رشید صاحب سے بدظن ہو گئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کو بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانے۔ وہ خفا ہو جاتے، تو پھر بخشتے نہیں تھے۔ رشید صاحب کچھ عرصے تک رنجیدہ رہے، مگر تقسیم کے بعد پھر انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ چاہیں، تو انجمن کا دفتر علی گڑھ لے آئیں۔ مولوی صاحب علی گڑھ آئے، جلسہ ہوا۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب خود اس کے حق میں ہو تھے۔ غرض فیصلہ علی گڑھ کے لیے نہ ہوا، مگر رشید صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ بزرگوں کی عزت اور ان کی خدمت کرنا کوئی رشید صاحب سے سیکھے!

رشید صاحب کو جلسوں، کانفرنسوں، مشاعروں سے بھی بالکل دلچسپی نہیں۔ اگر گرفتار ہو جائیں تو اس طرح پھڑپھڑاتے اور مضطرب ہوتے ہیں جیسے کوئی طائر دام میں پھنس گیا ہو۔ جلسے کے وقت پہنچتے ہیں، اور پہلی گاڑی سے بھاگ نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ جس جلسے کا انھوں نے افتتاح کیا، اس کے صدر کی تقریر بھی سننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ انھیں خود اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں کوئی مشاعرہ، یا ادبی صحبت منعقد کرنی پڑ جاتی، تو اور بات ہے، ویسے وہ ان چیزوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ میں نے کبھی رشید صاحب کو بلند آواز سے داد دیتے، یا شعر پر وجد کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں اچھے شعر سے ان کے چہرے پر ایک انبساط ضرور کھیلنے لگتا ہے۔ شعر انھیں یاد نہیں رہتے۔ اچھا شعر ہوا، تو یہی بہت ہے کہ انھیں شعر کا کوئی لفظ یا اس کی کوئی ترکیب یاد رہ گئی، ورنہ ایسے ویسے شعر سے تو وہ بالا بالا ہی گزر جاتے ہیں۔ انھیں مطالعے کا شوق ضرور

ہو، اور کسی کتاب یا مصنّف کی تعریف کی جائے" تو اس سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، مگر مصنّف کے خیالات سے مستفید ہونے کے بجائے اس کی چنگاری سے اپنا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تصوّرات سے زیادہ تصویروں کو، اصولوں سے زیادہ آدمیوں کو، اور علم سے زیادہ عمل کو دیکھتے ہیں۔ وہ جس سے جلتا جائیں یا چڑ جائیں اس کا کام ضرور کر دیتے ہیں، گو اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ وہ ضرورتمندکی بڑی مدد کرتے ہیں، اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمیوں نے ان کو اپنی فرضی ضروریات ظاہر کر کے بیوقوف بنایا ہے، مگر وہ مدد کر کے کسی شکریے یا احسانمندی کے منتظر نہیں رہتے؛ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل ہیں۔

رشید صاحب سے زیادہ طلبا کے ہمدرد کم نکلینگے۔ وہ اچھے طلبا کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق دیکھتے ہیں، نظریے یا نصب العین سے سروکار نہیں رکھتے، مگر وہ طلبا کی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دفعہ ہم لوگ علی گڑھ کی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ خبر ملی کہ طلبا اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے طلبا کا ایک ہجوم جمع ہو گیا، اور پولیس کی چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو میں نے بھی طلبا کو روکنے کی کوشش کی، مگر جب دیکھا کہ وہ اس وقت جوش میں ہیں اور کسی کی نہیں سنتے، تو میں الگ کھڑا ہو گیا۔ مگر رشید صاحب نہ مانے؛ وہ ہجوم میں گھس گئے اور انھیں آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ کچھ لڑکے خاموش ہو گئے، مگر کچھ زور سے ان سے بحث کرنے لگے۔ اتنے میں رشید صاحب کو کسی نے ایک دھکا بھی دے دیا، جو یقیناً غیر ارادی تھا، مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر میں انھیں نکال کر لایا۔ راستے میں جب میں نے اُن سے کہا کہ "کیوں، شہادت کے لیے کمربستہ ہو رہے تھے؟ فنکار تو آپکے نزدیک تماشائی ہوتا ہے، وہ معرکے میں حصّہ نہیں لیتا؟" کہنے لگے "فنکار گولی مارئیے، میں معلّم بھی تو ہوں۔ طلبا کو حماقت کرنے سے کیسے نہ روکوں؟" میں نے کہا: "اس کے لیے جس کی ضرورت ہے، وہ آپکے پاس نہیں ہے۔ یا پھر آپ کی آواز کسی سارجنٹ میجر کی سی ہونی چاہیے، جس سے آپ محروم ہیں"۔ رشید صاحب کا غصّہ اُتر گیا۔ کہنے لگے "کبھی کبھی رباب کے بغیر بھی گانا پڑتا ہے۔ علی گڑھ کی خاطر سب کچھ گوارا ہے"۔

رشید صاحب کی کچھ رائیں بڑی عجیب ہیں۔ مثلاً انھیں اس میں تامّل ہے کہ عورتیں مردوں

سے زیادہ ذہین بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کا عورت کا تصور رکچھ "خاتونِ مشرق" کا سا ہے۔ آنچل پرچم بھی بن سکتا ہے، یہ رشید صاحب مشکل سے مانیں گے۔ انھیں ہر اچھے شخص یا کام میں علی گڑھ کا فیضان ضرور نظر آتا ہے، گو وہاں دور دور تک اس قسم کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس معاملے میں وہ "ہمہ اوست" نہ سہی تو "ہمہ از دست" پر ضرور ایمان رکھتے ہیں۔ وہ مرنے والوں کی نکتہ چینی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، جب عصمت چغتائی کا مضمون "دوزخی" شائع ہوا تو میں نے بڑی تعریف کے ساتھ، وہ رشید صاحب کو پڑھنے کے لیے دیا۔ رشید صاحب کو مطلق پسند نہ آیا۔ کہنے لگے کہ "یہ کیسی بہن ہے، جو مرحوم بھائی کے متعلق اس طرح لکھتی ہے؟" میں نے کہا: "یہ اس فنکار کے قلم کا اعجاز ہے جو بہن ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ مصور اور بے جھجک نقاد بھی ہے۔" میں بحث کرتا رہا، مگر رشید صاحب کو قائل نہ کر سکا۔ ڈاکٹر ضیاالدین مرحوم سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سوانحِ عمری "ضیائے حیات" کے نام سے شائع ہوئی۔ میں نے اس پر "اُردو ادب" میں خاصی تفصیل سے ریویو کیا اور ڈاکٹر صاحب کی پیشتر دور کارناموں پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ رشید صاحب نے ریویو کی بڑی تعریف کی، مگر اس کے لب و لہجے کو اس لیے کہیں کہیں نامناسب قرار دیا کہ مرنے کے بعد نکتہ چینی ختم ہو جانی چاہیے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ کسی شخص پر سچی تنقید اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ انتقال کر چکا ہو، یعنی اس کی شخصیت کا رنگین نقاب نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔

رشید صاحب سے میں نے "اُردو ادب" کے لیے ایک مضمون کی فرمائش کی۔ جواب آیا کہ جس رسالے کا ایڈیٹر پورے رسالے کے مضامین اپنے قلم سے لکھ سکتا ہو، اُسے فرمائش کرنے کا کیا حق ہے؟ میں نے انھیں غیرت دلائی، خوشامد کی، دھمکیاں دیں، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون میرے پاس نکل آیا۔ غیر مطبوعہ اس لیے کہ یہ جگر صاحب کے نئے مجموعۂ کلام کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ جگر صاحب کا نیا مجموعہ ("آتشِ گل") ان کے لاابالی پن کی وجہ سے اب تک نہیں نکل سکا تھا، اس کی نقل تو نہ ملی، ان کے مضمون کی نقل مل گئی۔ میری شرافت دیکھیے، کہ میں نے انھیں اطلاع دے دی، کہ وہ مضمون بقول کسے

شائع ہونے جارہا ہے۔" دوسرے دن ایس، او، ایس آیا کہ مضمون نظرِ ثانی کے لیے بھیج دیا جائے۔ میں نے بھیج دیا۔ رسید آئی، اور یہ مژدۂ جانفزا کہ تین چار دن میں ٹھیک ٹھاک کرکے بھیج دوں گا۔ میں منتظر رہا۔ کچھ دن بعد اطلاع ملی کہ وہ مضمون کمپوز ہو گیا، اب عنقریب روانہ کیا جائے گا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مضمون مل ہی جائے گا۔ مگر دو تین دن کے بعد اطلاع ملی، کہ وہ ایک دوسرے پرچے کو دے دیا گیا ہے۔ میں نے بہت برا مانا اور بڑی سخت شکایت کی، جواب ندارد۔ اس عرصے میں عشرۂ محرم بھی آیا اور گزر گیا۔ چند دن اور گزرنے کے بعد میں نے پھر اپنی آزردگی ظاہر کی۔ جواب ملا، کہ محرم ختم ہو گیا۔ اب ماتم موقوف کیجیے! خط پڑھ کر ہنسی آ گئی، اور میں نے صدقِ دل سے رشید صاحب کو معاف کر دیا۔

ایک دفعہ اُردو کے سلسلے میں سمپورنا نند جی سے ملنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب وفد کے صدر تھے۔ یادداشت پہلے سے بھجوا دی گئی تھی۔ ہم لوگ پہنچے تو وزیرِ تعلیم بظاہر اخلاق، مگر دراصل رکھائی سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ یادداشت میں نے دیکھ لی ہے۔ کچھ اور کہنا ہو، تو فرمائیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ میں نے دو چار باتیں کہیں۔ پھر ڈاکٹر علیم نے مصرع اٹھایا۔ مگر فضا کچھ ایسی سرد تھی، کہ بات کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ غرض مشکل سے دس منٹ کی سرسری سی بات چیت کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ مجھے سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا، کہ وزیرِ موصوف نے ڈاکٹر صاحب جیسے مستند ماہرِ تعلیم کی بھی قرار واقعی تواضع نہیں کی، اور بہت رسمی لہجہ رہا۔ گھر آ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رشید صاحب کو ایک لمبا خط لکھا، جس میں اہلِ علم کی ناقدری اور اربابِ سیاست کی فرعونیت کا ذکر تھا۔ رشید صاحب نے پنسل سے جواب لکھا، جس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے: "سرور صاحب! میں سمپورنا نند کی بھینس کو کیا دیکھوں، مجھے تو گاندھی جی کی وہ دھوتی اور لنگوٹی یاد ہے۔" میں رشید صاحب سے متفق نہ ہو سکا، مگر اس جذبے کا احترام کیسے نہ کرتا!

ابھی حال کا واقعہ ہے کہ رشید صاحب نے مجھ سے کچھ پھولوں کے پودے لکھنؤ سے بھجوانے کی فرمائش کی۔ میں نے لکھا کہ "میں گلِ رخوں کی یاد سے فرصت پاؤں، تو پھولوں کی طرف بھی

توجہ کردوں تو رشید صاحب نے فوراً اپنی فرمائش واپس لے لی اور اس رعایت لفظی کی خوب داد دی۔ اچھے فقرے کا اثر رشید صاحب پر اچھے شعر کی طرح ہوتا ہے۔

رشید صاحب بڑے شریف آدمی ہیں اور ان میں شرافت کی سادہ کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ سادہ لوح نہیں، دوسروں کی شرافت سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا بھی جانتے ہیں۔ وہ تصورات کے نہیں، تصویروں کے؛ نظریات کے نہیں، نظر کے قائل ہیں۔ وہ کارناموں سے آدمیوں کو نہیں، آدمیوں سے کارناموں کو پرکھتے ہیں۔ وہ جہاں بھی سچی لگن، جذبہ اور جوشش دیکھتے ہیں، تو اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بیسوی صدی کے آغاز کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت، دونوں کو جزوِ ایمان جانتی تھی۔ وہ مذہبی قدروں سے زیادہ اخلاقی قدروں کے قائل ہیں۔ ان کا صحیفۂ اخلاق اس شعوری دور کے لیے قدرے پرانا ہے، مگر پھر بھی لائق توجہ ہے۔ انتہا پسندی کے اس زمانے میں وہ لبرل، معتدل اور مرنجاں مرنج ہیں۔ وہ خود سرپھرے نہیں، مگر سرپھروں سے انھیں شغف ضرور ہے۔ وہ خاصے جذباتی ہیں، مگر جذباتیت کے شکار نہیں۔ جن لوگوں کو ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے، وہ ان کو ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور رہیں۔ ان سے میں نے اکثر اختلاف کیا ہے، مگر اس کے باوجود میں ان کے لیے اپنے اندر احترام اور محبت کا ملا جلا جذبہ پاتا ہوں۔ وہ قائد نہیں ہو سکتے، مگر بڑے اچھے رفیق ہیں۔ ان کی تصانیف میں افکار سے زیادہ "شخصیت" کا حسن ہے۔ انھوں نے علم و ادب کو ایک عاشق کی طرح چاہا ہے۔ وہ اس ذہنی کرب سے دوچار نہیں ہو سکے، جو اس نسل کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی؛ مگر انھوں نے ہمیں جو مسرت و بصیرت عطا کی ہے، اس کی وجہ سے زندگی کچھ اور گوارا، پُرکیف اور پُرمعنی ہو جاتی ہے۔ وہ گلاب کے پھول اور عطرِ حنا کی طرح ہماری تہذیب اور اس کی رنگینی و رعنائی کی ایک علامت ہیں۔ ان کے بہت سے خیالات سے لوگ بڑی جلدی ان کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کمیونزم اور ترقی پسندی یا مغرب اور جدیدیت سے انھیں کوئی چڑ نہیں، بلکہ وہ بہودہ مال یا ہر فیشن پر اس لیے ہنس سکتے ہیں کہ ان کی تیز نظر

اس کے مضحکہ خیز پہلو دیکھ سکتی ہیں۔ انھوں نے آئی۔ سی۔ ایس یا مولوی کسی کا کبھی رعب نہیں مانا اور ہر قسم کی ذہنی غلامی کا پردہ فاش کیا۔ وہ ہر لیڈر کی کمزوری اور ہر بلندی کی پستی دیکھ لیتے ہیں۔ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے ایک رشید صدیقی بھی پیدا کیا ہے، جس میں سودا کا سا تخیل، اکبر کی سی صنعت لفظی اور غالب کی سی نکتہ سنجی اور شوخی ہے۔ انھوں نے ظرافت کو ادب بنانے میں حصہ لیا ہے اور ادب کو مشرقیت کی بعض صالح قدروں کا ترجمان بنایا ہے۔ اور "بقاے دوام" کے دربار میں ان کی جگہ محفوظ ہو۔

علی گڑھ سرسید کے خواب کی تعبیر ہے، پوری یا ادھوری، اس بحث کو فی الحال جہاں کا تہاں رہنے دیجیے۔ یہاں ذاکر صاحب کی پُرسوز شخصیت کی وجہ سے علم و عمل کی ایک نئی چنگاری ہے۔ یونیورسٹی کے بعد یہاں کے تالے، یہاں کا مکھن، یہاں کے بسکٹ اور یہاں کی گرد مشہور ہے۔ لیکن علی گڑھ کے اس عجائب خانے میں ایک اور قابلِ دید شخصیت رشید احمد صدیقی کی بھی ہے کیوں کہ ان سے مل کر اقبال کا خضرِ راہ یاد آتا ہے:

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب

خلیق انجم

رشید احمد صدیقی

'داعیِ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر اور مرعوب کر رکھا ہے، وہ میری ایک کمزوری ہے۔ یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظرِ عام پر آئیں، یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھیے کہ مقرب ترین اصحاب، حتیٰ کہ ازواج مطہرات، کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں، اور یہ اس لیے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے۔ اس محکِ آتشین پر آزمائے جانے کے لیے کون آمادہ ہے؟'

(رشید احمد صدیقی)

رشید صاحب کو جب پہلی بار میں نے دیکھا ہے، تو وہ خاصے بجھ چکے تھے۔ یوں تو بچپن ہی سے روگی تھے، لیکن اب صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ رنگا رنگ بزم آرائیاں طاقِ نسیاں اور محبانِ عزیز "گنجہائے گرانمایہ" بن چکے تھے۔

رشید صاحب سے ہماری پہلی ملاقات کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ میں نے اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے جب علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا، تو ہمیں سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوگی۔ رشید صاحب کا غائبانہ

تعارف ہمارے ایک استاد رہبر پرتاپ گڑھی صاحب نے کرایا تھا جو رشید صاحب کے عاشق تھے۔ رہبر صاحب ہی کے توسط سے ہم رشید صاحب کے بیشتر مضامین اور "گنجہائے گرانمایہ" کے تمام خاکے پڑھ چکے تھے۔ ہمیں ان کے بیشتر طنزیہ اور مزاحیہ فقرے ازبر یاد تھے۔ علیگڑھ پہنچے، تو دو تین دن داخلہ میں لگ گئے۔ فارغ ہوتے ہی پہلا خیال رشید صاحب کا آیا۔ خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی ان دنوں ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان سے اچانک ایک دن ملاقات ہو گئی۔ ہم نے پہلا سوال یہی کیا کہ رشید صاحب سے کہاں اور کیسے ملاقات ہو گی؟ وہ رشید صاحب کے پرانے شاگرد اور رمز شناس تھے، کہنے لگے، یونیورسٹی کھلنے پر شعبۂ اردو میں۔

گھر پر؟

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اچھا آپ اُن کے گھر کا پتہ بتا دیجیے۔ ہم قسمت آزمائی تو کر لیں۔

خلیل صاحب نے ہمیں بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بالآخر ہماری ضد کے سامنے سپر ڈال دی۔ دوسرے ہی دن ہم اور اسلم پرویز رشید صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ دروازے پر دستک دی، نوکر آیا۔ اس کے تیور نوکر کے کم اور تھانیدار کے زیادہ تھے۔ اُس نے پورا دروازہ نہیں کھولا۔ بس صرف اتنی جھری کھولی کہ گفتگو ہو سکے۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی رہی۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے ارادوں سے بخوبی واقف ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہم کس انداز سے حملہ کرینگے۔ نیم باز دروازے اور نوکر کے چہرے کی خود اعتمادی نے ہمارے ہتھیار چھین لیے تھے۔ اپنی مکمل شکست کے یقین کے باوجود ہم نے حملہ کر ہی دیا۔

رشید صاحب ہیں گھر پر؟

اس نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

کب آئینگے؟

اُس نے دروازے کی جھری میں سے سیدھا ہاتھ نکال کر پانچوں انگلیوں کو مخصوص انداز میں

گھمایا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے کیا معلوم! اس سے پہلے کہ ہم کوئی اور حملہ کرتے، اس نے دروازہ بند کر دیا۔ نوکر کے اس رویّے سے ذلت کا اتنا شدید احساس ہوا کہ غالب کا وہ مشہور مصرع "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" تک یاد نہیں آیا۔ شام کو جب خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا: مل آئے رشید صاحب سے؟ تو جی چاہا کہ ان سے گلے لگ کر رونے لگیں۔

دو چار دن بعد جب یونیورسٹی کھلی، تو رشید صاحب سے ملاقات کی تمنا پھر جوان ہوگئی۔ اب حالات سازگار تھے یعنی شعبے میں ملاقات ممکن تھی۔ ایک دن اس نیت سے ہم اُردو ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ لکڑی کے پارٹیشن کے پیچھے ایک کونے میں رکھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز کچھ پڑھنے میں مصروف ہیں ______ سفید شیروانی، علیگڑھ کٹ پاجامہ، سر پر رامپوری ٹوپی۔ سنہری فریم کی گول شیشوں والی عینک۔

انھوں نے گردن اٹھا کر ہمیں ایک نظر دیکھا، اور پھر مطالعے میں مصروف ہوگئے۔

عرض کیا: "رشید صاحب سے ملنا ہے"

"فرمائیے"

پھر عرض کیا "رشید صاحب سے ملنا ہے!"

"جی، میں ہوں۔ کیا کام ہے؟"

ان الفاظ سے ہماری کیفیت اُس شکاری کی سی ہوگئی، جو جنگل میں چہل قدمی کر رہا ہو، اور اچانک شیر سامنے سے آجائے۔ اس سے پہلے کہ ہم خود پر قابو پائیں، رشید صاحب نے پھر وہی سوال دہرایا: "فرمائیے، کیا کام ہے؟"

"جی! آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے تھے!"

"تو کر لیجیے" (رشید صاحب کے اس جواب کا لطف ہم نے بہت بعد میں اٹھایا)

کسی اتنے بڑے ادیب سے ملاقات کا پہلا اتفاق تھا اور وہ بھی بغیر وساطت کے۔ "تو کر لیجیے" کے بعد سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ملاقات کیسے کی جائے۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری

ہوگئی۔ اور پھر رشید صاحب نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔
میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا؛ "کرسیاں کھینچ لیجیے۔ تشریف رکھیے"۔ ہم دونوں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔
پھر خاموشی۔
"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"
"جی، دہلی سے"
"کس کلاس میں داخلہ لیا ہے؟"
"جی! انٹرمیجیٹ میں۔
"آپ لوگ دہلی کے رہنے والے ہیں، یا پنجاب کے؟"
ہمارے لیے یہ سوال بہت عجیب تھا۔ عرض کیا: "جی، خاص دلی کے (اس دفعہ ہم نے دہلی کو دلی کہہ کر دکھایا)۔ فرمایا: تو پھر آپ "جی" کا اتنا استعمال کیوں کرتے ہیں؟
ہم نے کہا: "جی، بس یونہی"
یہ بات بہت دن بعد سمجھ میں آئی کہ دلی والے "جی" کا استعمال فقرے سے پہلے اور پنجاب والے فقرے کے بعد کرتے ہیں۔
"اچھا، اب کلاس میں ملاقات ہوگی"۔
لیجیے، ملاقات ختم۔ ہمارے ذہنوں میں رشید صاحب کی جو تصویر تھی، وہ تو اس سے بالکل مختلف نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ تحریروں کی طرح گفتگو میں بھی ان کی ہر بات میں بات ہوگی۔ وہ ایسے ہنس مکھ انسان ہونگے جن کی گل افشانی گفتار سے محفلیں زعفران زار ہونگی۔ لیکن وہ تو اس کے بالکل برعکس نکلے۔ رشید صاحب کو خانقاہ کے پاسبان کے ہاتھوں، وہ اذیت ناک تجربہ نہیں ہورہا تھا، جو ہمیں آج شعبۂ اُردو میں ہوا۔ ہم آداب کرکے "اچھے دا" کرتے ہوئے شعبۂ اُردو سے باہر آگئے۔ آج کی اس مختصر اور بدمزہ ملاقات نے ہمیں رشید صاحب سے بالکل بددل کردیا۔ بلکہ ہم علیگڈھ اور سرسید تک سے بددل ہوگئے۔ ان دونوں کے بارے میں تو ہمارے ذہن میں کچھ اس طرح کے خیالات آتے کہ ان کے اظہار سے

اندلنٹ، جلسئہ، جلوس و فساد ہے۔

اس مختصر سی ملاقات سے جو بد دلی پیدا ہوئی تھی، وہ کافی دن میں گئی؛ اور اس میں رشید صاحب کی نہیں، خود ہماری کوششوں کو دخل تھا۔ ہم نے علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ان رشید احمد صدیقی سے جُدا کرلیا، جو مضامینِ رشید، خنداں اور گنجہائے گرانمایہ کے مصنّف تھے۔

رشید صاحب نے اپنے چاروں طرف ایک حصار بنا رکھا تھا، جس میں بہت کم خوش نصیبوں کو داخل ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہو۔ دو سال ان کے شاگرد رہنے کے باوجود میں اس سعادت سے محروم رہا۔ بدنصیبی سے میرے ان کے تعلقات بہت عجیب رہے۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے انھیں کبھی متاثر نہیں کرسکا۔ ایک استاد کی حیثیت سے وہ مجھے متاثر نہیں کرسکے۔ اس میں ان کی کم گوئی اور کم آمیزی کے ساتھ ساتھ شاید مردم شناسی کو بھی دخل ہو۔ ان سب کے باوجود میں ہمیشہ اپنے خیالوں کے رشید احمد صدیقی کا پرستار رہا۔ آج جن رشید صاحب کے بارے میں کچھ عرض کر رہا ہوں انھیں میں نے اپنی آنکھوں سے بہت کم، ان خوش نصیبوں کی آنکھوں سے زیادہ دیکھا ہے، جنھیں اس محفل میں بار حاصل رہا۔

رشید صاحب کی اسّی سال کی طویل عمر کے مقابلے میں ان کے دوستوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر کم آمیز ہیں۔ بڑی مشکل سے کسی کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ لیکن اگر ایک بار وہ کسی کے دوست ہو گئے، تو پھر اپنا سب کچھ اس پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دوستی کے بارے میں ان کے بعض فقرے تو ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً "مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو ووٹ میں اپنے دوست ہی کو دوں گا" یا "میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبریل بھی آسمان سے اُتر کر آئیں، تو میں دوست ہی کی حمایت کروں گا۔"

دوست سے وفاداری کا تصوّر جاگیرداریت کی صالح اور راز رفع اقدار میں سے ہو۔ اور رشید صاحب ساری زندگی اسی قدر کو سینے سے لگائے رہے۔ دوست کی دوستی سے کام، اس کے افعال سے کیا کام! کہا جاتا ہے کہ وہ دوستوں کی تمام خامیوں کو نظر انداز

کر دیتے ہیں۔ ان کے خاکے پڑھنے والے یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ رشید صاحب اپنے دوستوں کی خوبیوں کے قصیدے پڑھتے ہیں، اور ان کے عیب دانستہ چھپا جاتے ہیں۔ لیکن رشید صاحب کو قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی نظر دوست کے عیب پر کبھی پڑتی ہی نہیں۔

دوستوں کی بات تو چھوڑیے، وہ تو اپنے دشمنوں کی بھی کبھی برائی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نے انھیں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی کسی سے آزردہ ہوئے، تو انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں اس سے سامنا نہ ہو جائے۔ ہر اُس جگہ جانے سے گریز کرتے ہیں، جہاں اس شخص سے ملنے کا امکان ہو۔ اگر کسی سے ناراض ہوں، اور وہ کوئی کام لے کر آ جائے، تو دنیا کا ہر کام چھوڑ کر پہلے اس کا کام کرینگے۔ اسے وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ جس شخص سے تعلقات میں کشیدگی آ جائے، اس کے بارے میں کوئی رائے دینے سے ہر ممکن گریز کرینگے۔ کسی شخص سے ان کی ناراضی کی یہ انتہا ہے کہ رشید صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ "فلاں صاحب، بس یونہی ہیں"۔

بہت کم لوگ ہونگے جنھوں نے دوسروں کی خاطر رشید صاحب کی طرح اتنی تکلیفیں اٹھائی ہوں۔ گھر کا کوئی فرد ہو، رشتہ دار، دوست یا شاگرد ـــــ رشید صاحب سب کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات صاحب معاملہ سے زیادہ پریشانی کا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ کبھی کسی اور کو اپنے غم اور دکھ درد میں شریک نہیں کرینگے۔ ۱۹۵۹ء میں جب ان کی جوان جہان لڑکی کا انتقال ہوا، تو کافی عرصے تک انھوں نے خود کو کمرے میں بند رکھا۔ لوگ تعزیت کرنے آئے اور گھر کے دوسرے افراد سے مل کر چلے گئے۔ مگر رشید صاحب باہر نہیں آئے۔ جب اس سانحے کا اثر کچھ ہلکا ہوا، تو انھوں نے لوگوں سے پھر ملنا شروع کیا۔

رشید صاحب مہمانوں کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس لیے عام طور پر ان کا

گھر مہمان سرائے بنا رہتا اور بعض اوقات تو مہمانوں کی اکثریت گھر والوں کو اقلیت میں بدل دیتی ۔ ان مہمانوں میں رشتے دار بھی ہوتے اور دوست بھی ۔ کبھی کبھی کوئی مہمان ایسا بھی ستم کر جاتا کہ سارے گھر والے تڑپ کر رہ جاتے ۔ اس ستم میں خود رشید صاحب کی بھی سازش ہوتی ، اگر کوئی مہمان کسی چیز کی تعریف کر دیتا ، تو فوراً اس کا حق ملکیت اس کے نام منتقل کر دیا جاتا ۔ رشید صاحب کی ایک کمزوری خرید و فروخت بھی رہی ہے ۔ کسی زمانے میں انھیں نئی نئی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا ۔ اس سے بھی بڑی کمزوری اپنی پسند کی داد حاصل کرنا تھی ۔ مہمان کو چیز دکھائی جاتی ، اس سے داد حاصل کی جاتی ، اور پھر وہ چیز اس کے سامان میں باندھ دی جاتی اور بچے منہ دیکھتے رہ جاتے ۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ ہے ، جو غالباً رشید صاحب کے تمام بچوں کے ذہن پر نقش ہے ۔

ریڈیو بھی علیگڑھ میں عام نہیں ہوئے تھے ، سارے شہر میں تین چار سے زیادہ سیٹ نہیں ہونگے ۔ رشید صاحب بھی ایک ریڈیو خرید لائے ۔ ابھی بمشکل دو تین دن ہوئے تھے کہ ایک مہمان آ ٹپکے ۔ ریڈیو کی مدح میں قصیدہ پڑھا گیا ، اور ریڈیو ان کے حوالے ہو گیا ۔ بیوی بچوں کے دل پر جو گزری وہ گزری ، لیکن رشید صاحب کے چہرے پر مسرت و انبساط کے وہ آثار تھے ، جو کسی انتہائی مشکل مقصد میں کامیاب ہونے والے کے چہرے پر ہوتے ہیں ۔

ان مہمانوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین ، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ اس طرح کے مہمانوں کی آمد سے رشید صاحب کی عید ہو جاتی تھی ۔ رشید صاحب کو کھانے پینے کا ہمیشہ سے شوق رہا ۔ مہمانوں کے آنے سے گویا اچھے کھانے اور پکانے کا موقع (اور جواز) ہاتھ آ جاتا ۔ خوب دعوتیں ہوتیں ۔ رات گئے تک ادبی محفلیں اور مشاعرے جمتے ۔ دیکھنے والے اور سننے والے کہتے ہیں کہ ان موقعوں پر رشید صاحب بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے ۔ جب تک ڈاکٹر نے انھیں نمک تک کھانے سے منع نہیں کر دیا ، ان دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ ان دعوتوں اور

محفلوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کبھی حکّام نہیں بلائے جاتے تھے اور کبھی کسی بد ذوق کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔

بیوی بچّوں کے ساتھ رشید صاحب کا وہی رویّہ ہے، جو دوستوں کے ساتھ ہے۔ انھیں اچھے سے اچھا کھلایا، اچھے سے اچھا پہنایا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی۔ غرض ایک انتہائی ذمے دار باپ اپنی اولاد کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے، وہ رشید صاحب نے کیا۔ لیکن خود پوری زندگی انتہائی سادگی سے گزار دی۔ بچّوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ بچوں پر چیخ پکار کی بجائے ہمیشہ طنز و مزاح سے اس طرح کام لیا کہ بچّے کی اصلاح بھی ہو گئی، اور گھر کا ماحول بھی خراب نہیں ہوا۔ اگر کسی بچّے سے ناراض ہوئے تو لفظ "بیٹا" یا "بیٹی" کو اس طرح چبا کر اور کھینچ کر ادا کرتے کہ مخاطب ان کی ناراضی سے واقف ہو جاتا۔ اپنے کام کے لیے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا، اپنا سارا کام خود کرتے رہے۔ ہر روز اپنا بستر خود ٹھیک کرتے، مچھر دانی لگاتے، میز صاف کرتے، اور حد تو یہ ہے کہ اپنے کمرے میں جھاڑو بھی خود دیتے۔ تولیہ اور پلنگ کی چادر ہمیشہ صاف رکھتے۔ نوکروں کو بھی گھر کے افراد شمار کرتے۔ کبھی کسی نے انھیں نوکر پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی خلاف مرضی کام کرتا، تو اس کی سطح کے طنز و مزاح سے کام لیتے۔ شعبۂ اُردو کے چپراسی تک رشید صاحب کے اس رویّے کی وجہ سے خود کو صدر شعبہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

رشید صاحب کی شرافت اور ان کی دوستی کی تعریف دوست احباب تو خیر کرتے ہی ہیں، خود ان کے دشمن تک کرتے ہیں۔ اور یہ مرتبہ وہ ہے، جو بعض پیغمبروں تک کو نہیں ملا۔

رشید صاحب کی جن خصوصیات نے مجھے غیر معمولی طور سے متاثر کیا ہے، ان میں ان کی مذہبی رواداری اور وسیع المشربی بھی ہے۔ رشید صاحب نے بچپن کے ایک برہمن استاد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اتنے ہی کٹّر برہمن تھے، جتنے شریف النفس

اور درد مند انسان"۔ خود رشید صاحب کی زندگی بھی اس قول کی مکمل آئینہ دار ہے۔ وہ عقیدے کے راسخ مسلمان ہیں، مسلمانوں کے دکھ درد سے تڑپ اٹھتے ہیں، لیکن دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بچپن کا وہ ماحول ہے جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا۔ قاعدۂ بغدادی، کلام پاک، تختی لکھنے کی اور فارسی اور عربی کی تعلیم انھوں نے گھر ہی پر مولویوں سے حاصل کی۔ اسکول جانا شروع کیا، تو ماحول بالکل مختلف تھا۔ ہندو بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ماسٹر صاحب ملے، تو ایسے کہ بقول رشید صاحب "کوئی کلاس ہو، وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن"۔ علاقے میں طاعون پھیلتا، تو یہ اسکول ایک مندر میں منتقل ہو جاتا، جہاں طرح طرح کی چھوٹی بڑی مورتیاں جا بجا رکھی ہوئی تھیں۔ اور بقول رشید صاحب جو مورتیاں برآمدے اور صحن میں تھیں، ان کے چھونے کی ہمیں اجازت تھی۔ ہم سب یعنی ہندو مسلمان طلبہ دونوں اس پر خوش تھے کہ مورتیوں کو چھونے کا منصب ہم کو حاصل تھا۔ اسکول کے مندر میں منتقل ہو جانے سے ماسٹر صاحب کے، جو پنڈت تھے، مزے ہو جاتے۔ دن بھر بھجن، رامائن، اشنان، آرتی اور پوجا پاٹھ میں مشغول رہتے، اور تمام طالب علم انھیں دیکھنے میں اپنے عقائد پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے "دیہات اور شوالے کی فضا میں جو ابتدائی تعلیم میسر آئی، اس نے ذہن و دماغ کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ طنز و ظرافت باوجود مدت العمر ادبی مشغلہ ہونے کے، آج تک اس کا اتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے۔ علیگڈھ آیا، تو اس پر مزید مہر لگ گئی۔ اور شاید یہ دونوں کا تصرف تھا کہ حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ کبھی نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی سنا دوں۔

رشید صاحب ہمیں دیوانِ غالب پڑھاتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ سب طالبعلم دیوان غالب کھول کر بیٹھ جاتے۔ رشید صاحب آنکھ کے اشارے سے کسی طالبعلم

سے کہتے۔ وہ ایک شعر پڑھتا، اور پھر اس کی شرح کرتا۔ اگر شعر اس کی سمجھ میں نہ آتا یا مفہوم بیان کرنے میں اس سے کوئی غلطی ہو جاتی، تو رشید صاحب دیوانِ غالب پر سے نظریں اٹھا کر اس طالبعلم کی طرف اس طرح سے دیکھتے، جیسے غالب کے شعر کا ایسا بے رحمانہ قتل ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ استاد اور شاگرد چند لمحوں کے لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے۔ اس دوران میں طالبعلم اپنی نااہلیت کا اعتراف کر لیتا، تو رشید صاحب کسی اور طالبعلم کی طرف متوجہ ہوتے اور آنکھ ہی کے اشارے سے اسے حکم دیا جاتا۔ ایک دن یہ مرحلہ غالب کے اس شعر پر پیش آگیا:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں سب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

ایک صاحب نے اس کا مفہوم غلط بتایا۔ دوسرے صاحب نے مفہوم تو صحیح بتایا، لیکن ضمناً کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے، جن سے اسلامی عقائد کی نکتہ چینی کا پہلو نکلتا تھا۔ بس پھر کیا تھا، ایک اور صاحب آتشِ نمرود میں دیوانہ وار کود پڑے۔ یہ صاحب ہر وقت دائرۂ اسلام وسیع کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ انھیں غالب کی یہ آزاد خیالی اور بقول ان کے مذہبی بے راہ روی قطعی ناپسند تھی۔ کلاس میں گرما گرم بحث ہو گئی۔ غالب کے طرفدار دس بارہ لڑکے ایک طرف، اور دو تین حامیانِ توحید دوسری طرف۔ باقی کلاس غیر جانبدار، یعنی تماشائی بن گئی۔ تمام طلبا رشید صاحب کا غیر معمولی احترام کرتے تھے، اس لیے کلاس میں کسی طرح کی بدتمیزی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مگر آج چونکہ مقطع میں اسلام کی بات آپڑی تھی، اس لیے مجاہدین کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی تھی۔ دوسری طرف غالب کے طرفداروں کی غیرت اور اس سے زیادہ غالب دوستی کے جذبات کی رسوائی کا خاصا سامان ہو چکا تھا۔ اس لیے کچھ دیر کے لیے طرفین کو رشید صاحب کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ رشید صاحب خاموشی سے مباحثہ سنتے رہے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں یہ مناظرہ

پسند نہیں۔ چونکہ انھیں کسی کو کچھ کہنے کی عادت ہی نہیں تھی، اس لیے حسب معمول خاموش رہے۔ بحث بہت جلد ہی غالب کے شعر کے حدود پار کرتی ہوئی دوسرے مذاہب کی خامیوں کے شمار تک پہنچ گئی۔ اب رشید صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ فرمانے لگے: اچھا مسلمان وہی ہے، جو تمام مذاہب کا احترام کرے۔ (مفہوم یہی تھا، الفاظ میرے ہیں) اس کے بعد اس موضوع پر انتہائی مختصر الفاظ میں ایسی دلنشین تقریر کی، کہ مباحثہ ختم ہوگیا۔

جب مذہب کے نام پر علیگڑھ کو سیاست کا اکھاڑا بنایا گیا، تو سیاستدانوں اور ان کے شکار طالبعلموں کی ناعاقبت اندیشی اور بےراہ روی کے مظاہرے دیکھ کر رشید صاحب غم و غیرت سے تڑپ اٹھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "آشفتہ بیانی میری" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ایک بیباک اور حق گو انسان ہی کر سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> پھر علی گڑھ پر ایک وقت ایسا آیا، جب سیاست نے مذہب سے، یا مذہب نے سیاست سے رشتہ جوڑ کر یہاں کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ علم و ادب کی تحصیل و تحقیق اور سچائی کے ساتھ نوجوانوں کو صالح و صحتمند اقدار کو اپنانے اور پھیلانے کی تلقین کی جا سکتی یا تربیت دی جا سکتی ..... اقبال کا مشہور مصرع مجھے اکثر یاد آیا ہے:
>
> جُدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی
>
> سوچتا ہوں، کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہوگا، وہ قابل قبول ہے، یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی کا سابقہ ہوگا وہ قابل ترجیح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر وہ کسی سیاسی جماعت کے مخالف ہیں، تو صرف مسلم لیگ کے۔
غرض رشید صاحب تمام مذاہب کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ خود پکے مسلمان ہیں۔ اور اسی لیے مسلمانوں کے دکھ درد سے بہت ملول و مضطرب ہوتے ہیں۔ میں جس زمانے

ماہنامہ سیکولر ڈیموکریسی کا ایڈیٹر تھا، خود بھی مسلمانوں کے مسائل پر مضامین لکھ رہا تھا، اور دوسروں سے بھی لکھوا رہا تھا۔ رشید صاحب نے اس شمارے کا مطالعہ کیا جس میں بنگلا دیش، مسلمانوں سے چند سوالات، مشترکہ کوڈ جیسے موضوعات پر مضامین تھے۔ ان مضامین کے بارے میں انھوں نے مجھے ایک خط لکھا (یہ خط سیکولر ڈیموکریسی کی جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اس میں لکھتے ہیں:

"..... رسالے کے اور مضامین بھی جہاں تہاں سے پڑھ گیا۔ ہندستان اور پاکستان کی حالیہ جنگ کے بعد سے ہندستان کے مسلمانوں سے باز پرس کے کیسے اور کیسے کیسے گوشے آئے۔ دن روشن یا روشن تر ہوتے جاتے ہیں، اس کا پہلے کبھی اندازہ نہیں تھا۔ خدا کرے، یہ زہر غم تلخی کام و دہن کی آزمایش یہیں تک ختم ہو جائے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ خط بھی ہے جو رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

دو باتوں کا خیال رکھیے۔ ایک تو یہ کہ جو گاڑی مجھے اسٹیشن پر لینے آئے وہ صدر ہندوستان کی گاڑی نہ ہو، بلکہ کسی معمولی سی گاڑی ہو، جس میں سے باوردی ڈرائیور نہ نکلے۔ میں باوردی ڈرائیور سے نروس ہو جاتا ہوں۔ دوسرے، آپ تکلف نہ کریں، کھانا اپنے ساتھ لا رہا ہوں۔

یہ اس خط کا تقریباً مفہوم ہے جو رشید صاحب نے اپنے عزیز ترین دوست ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو دلی آتے ہوئے لکھا تھا۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس خط میں تصنع اور بناوٹ نہیں، بلکہ یہ ان کی پوری شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ رشید صاحب بڑے لوگوں سے ملنے سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ یونیورسٹی کے صاحب اقتدار لوگوں سے ان کے تعلقات رسمی شرحِ منصبی کی حد تک رہے۔ اس سے آگے ان تعلقات کو بڑھانے کی انھوں نے کبھی کوشش کی، نہ خواہش۔ اگر ان کا کوئی قریب ترین دوست بھی بڑا آدمی بن گیا، تو اس کی بڑائی

اللہ دونوں کے تعلقات کے درمیان دیوار بن جاتی، جیسا کہ ذاکر صاحب کے ساتھ ہوا۔ ذاکر صاحب پر ایک مضمون میں رشید صاحب نے لکھا ہے "میں دوست کے فضائل پر مرتا ہوں، نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو رشید صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے دو بار خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کی۔ لیکن رشید صاحب نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ سیاستدانوں میں رشید صاحب کو پنڈت نہرو سے بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ پنڈت جی بھی رشید صاحب کی عظمت کے قائل تھے۔ لیکن رشید صاحب نے بات اس سے آگے نہیں بڑھنے دی۔

رشید صاحب ان خوش نصیب فنکاروں میں سے ہیں، جو اپنی زندگی ہی میں شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ گئے، لیکن وہ شہرت کے پیچھے نہیں بھاگے؛ شہرت ان کے پیچھے بھاگی۔ ذاتی پروپیگنڈا بڑے سے بڑے فنکار کی کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں رشید صاحب کی مثال ہندوستان کی تو بات ہی کیا، عالمی ادب میں بھی مشکل سے ملیگی۔ انھیں پسند نہیں کہ ان پر کچھ لکھا جائے۔ کئی بار مختلف رسالوں نے رشید احمد صدیقی نمبر نکالنے کا اعلان کیا لیکن رشید صاحب کی ناراضی سے ڈر کر ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ انھیں یہ بھی پسند نہیں کہ ان کے ذاتی خطوط بھی شائع کیے جائیں۔ اس معاملے میں تو وہ غلو کی حد تک کام لیتے ہیں۔ کبھی کسی کا خط اپنے پاس نہیں رکھتے۔ خط موصول ہوا، جواب لکھا اور خط پھاڑ دیا۔ میں نے سنا ہے کہ پطرس بخاری، اصغر گونڈوی، ذاکر صاحب، جگر صاحب، پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں جیسے مشاہیر کے خطوط بھی ان کی اس عادت کی نذر ہو گئے۔ کئی برس کی بات ہے، غالباً ہماری زبان میں ان کا ایک خط شائع ہوا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ "یہ ان کی وصیت ہے کہ ان کے تمام خطوط ضائع کر دیے جائیں"۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ وہ رشید صاحب سے ملنے گئے؛ اور ٹیپ ریکارڈر اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مختلف مسائل پر ڈیڑھ دو گھنٹے گفتگو ہوتی رہی، اور انھوں نے رشید صاحب کو بتائے بغیر تمام گفتگو ریکارڈ کر لی، بعد میں اُسے مرتب کر کے

شائع کر دیا۔ رشید صاحب کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اس کا اظہار انھوں نے خود مجھ سے فرمایا۔ میرے ساتھ بھی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ پچھلے سال میں ترقی اردو بورڈ کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے علیگڑھ گیا۔ تین دن کا سیمینار تھا۔ دو دن انتہائی مصروفیت میں گزر گئے۔ تیسرے دن ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل اور مجھے ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آ رہے تھے کہ میں نے مسعود صاحب سے عرض کیا، رشید صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔

آپ نے پہلے سے وقت لیا ہے؟

جی نہیں۔

تو مشکل ہے۔

ہمیں علم تھا کہ رشید صاحب قبلہ مسعود صاحب کا بہت خیال کرتے ہیں۔ سوچا، اگر وہ ہمارے ساتھ ہوں، تو شاید ملاقات ہو جائے۔ اصرار کر کے مسعود صاحب کو راضی کر لیا۔ رشید صاحب کے ہاں پہنچے۔ ایک پرچے پر سب کے نام لکھے، مسعود صاحب کا نام سب سے اوپر لکھا۔ اور نوکر کے ہاتھ پرچہ اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد شرف ملاقات بخش گیا۔ بات چیت ہوئی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا، جیسے رشید صاحب کچھ نروس ہیں۔ میں اپنے ساتھ کیمرہ لیتا گیا تھا۔ میں نے کیمرہ نکالا۔ رشید صاحب نے انتہائی نرمی سے کہا: فوٹو نہ لیجیے۔ میں نے اصرار کیا۔ رشید صاحب نے اب کے انتہائی ناگواری کا اظہار کیا۔ مجبور ہو کر میں نے کیمرہ بند کر لیا۔ اس پر رشید صاحب نے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی شرارت کا قصہ سنایا۔ مسعود صاحب رشید صاحب کے مزاج داں ہیں۔ انھوں نے اچانک کہا: اچھا اجازت دیجیے۔ رشید صاحب نے ایک بار بھی ہم سے رکنے کے لیے نہیں کہا۔ جب ہم لوگ باہر آ گئے، تو مسعود صاحب نے بتایا کہ رشید صاحب ملاقاتیوں سے نروس ہو جاتے ہیں، بلکہ اب تو ان کے نروس ہونے کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص دروازے کی گھنٹی بجا دے، یا ڈاکیہ تار لے آئے، تو وہ گھبرا جاتے ہیں۔

جب کوئی فنکار آپ بیتی لکھتا ہے، تو کیا کیا لن ترانیاں کرتا ہے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت

اور دوسروں پر اپنے تفوق کے کیا کیا قصیدے پڑھتا ہے، بلکہ دوسروں پر مضامین لکھتے ہوئے بھی اپنی مدح کے پہلو نکال لیتا ہے۔ رشید صاحب نے ہمیشہ "در مدح خود" قسم کی چیزوں سے گریز کیا۔ "آشفتہ بیانی میری" میں انھوں نے جس انکساری اور خاکساری کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسلاف کی تو بات ہی کیا، انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار تک کا ذکر نہیں کیا۔ پوری کتاب میں اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک آدھ جملے سے زیادہ نہیں لکھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پا جاتی"۔ حالاں کہ رشید صاحب سے بہت کم درجہ کے ادیب اور شاعر اس موقع پر کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ جب میں نے پہلا مضمون لکھا، تو چاروں طرف دھوم مچ گئی اور ایڈیٹر حضرات گھر کے چکر کاٹنے لگے۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ مضمون کا مصنّف اتنا کم عمر لڑکا ہو سکتا ہے۔ پھر میرا امتحان ہوا۔ میں اس میں پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہا وغیرہ۔ رشید صاحب نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے علیگڈھ پر توجہ مرکوز کرکے بات کا رُخ ہی بدل دیا۔ اپنے بارے میں انھوں نے بہت صحیح کہا ہے کہ "میں بذاتِ خود کچھ مقامی سا آدمی واقع ہوا ہوں۔ آفاقی یا ماورائی قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں، نہ حوصلہ، نہ ہوس" یہ اور بات ہے کہ پوری کوششوں کے باوجود انھیں آفاقیت نصیب ہو گئی۔

شہرت کی طرح رشید صاحب دولت سے بھی بے نیاز رہے۔ وہ کبھی پیسہ جمع کرنے کے چکر میں نہیں پڑے۔ کبھی تالا چابی استعمال نہیں کیا۔ اور کبھی کسی بنک میں حساب نہیں کھولا۔ جب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پراویڈنٹ فنڈ کا چیک ملا، تو ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ان کے ایک عزیز کمال الدین صاحب کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہوا۔ کمال الدین صاحب بہت عرصے سے ان کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس عمر میں رشید صاحب کا بہت بڑا سہارا ہیں۔

دولت جمع کرنے، یا جائداد بنانے میں انھیں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ جس مکان میں رہتے ہیں،

وہ البتہ ان کی اپنی ملکیت ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں یونیورسٹی کیمپس میں کچھ پلاٹ فروخت ہو رہے تھے۔ اکثر لوگوں نے پلاٹ خریدے، لیکن رشید صاحب نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کے ایک عزیز دوست ایوب انصاری نے بڑا اصرار کرکے انھیں پلاٹ خریدنے پر آمادہ کیا۔ اور پھر ان کے اور دوسرے دوستوں کے اصرار اور کوششوں سے مکان کی تعمیر ہوئی۔

گھر میں رشید صاحب کا روپے پیسے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ خرچ ہمیشہ ان کی بیگم کے ہاتھوں میں رہا۔ ان کی میز پر البتہ کچھ ریزگاری پڑی رہتی تھی، جو بچوں کو دی جاتی تھی۔

کسی زمانے میں رشید صاحب کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ پاندان ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، اور اپنے لیے پان خود بناتے تھے۔ اب ڈاکٹروں نے اچھے کھانوں کے ساتھ، پان کھانے پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔

رشید صاحب کو گلابوں کا بھی بہت شوق ہے۔ گھر میں ایک بہت خوبصورت باغیچہ بنا رکھا ہے۔ پہلے تو کئی کئی گھنٹے نیکر اور بنیان پہنے مالی کے ساتھ باغیچے میں لگے رہتے تھے۔ اور اس دوران میں ذکر کو ملاقاتیوں سے کہنا پڑتا تھا کہ رشید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ اس شوق کے بارے میں رشید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں "باغ مجھے بہت پسند ہیں۔ درختوں، پودوں کو تھوڑی سی راحت پہنچا دیجیے، شاداب و شگفتہ ہو جائینگے۔ اور آپ محسوس کرینگے کہ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ آپ کی محبت و محنت کا معاوضہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ گلاب کے پھولوں کے بارے میں رشید صاحب کی معلومات غیر معمولی ہیں۔ وہ انسان اور پھولوں کے حسب و نسب کو برابر اہمیت دیتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی عزیز کے مسلسل اصرار پر وہ راشٹرپتی بھون کا مغل گارڈن دیکھنے کو دلی آئے۔ وہاں گلاب کے پھول دیکھ کر بہت بد مزہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت سے پھولوں اور اچھے پھولوں میں بڑا فرق ہے۔ "بہت سے پھول" ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

گھر میں جب پھول کھلتے، تو ان کا سب سے دلچسپ مشغلہ ان کی خوبیاں بیان کرنا ہوتا۔

ہر آنے جانے والے کو کھول دکھاتے، اس کی قسم اور دوسری تفصیلات پر روشنی ڈال کر، اس طرح داد چاہتے۔ جس طرح کوئی شاعر کلام سنا کر داد کا طالب ہوتا ہے۔

رشید صاحب اب تو مضمون نہیں لکھتے، جس زمانے میں لکھتے تھے، تو ان کا لکھنے کا عجیب انداز ہوتا تھا۔ میز کرسی کے بدلے وہ کھٹولے اور مونڈھے سے کام لیتے تھے۔ کھٹولے پر خود بیٹھ جاتے اور مونڈھے سے میز کا کام لیتے۔ کبھی مونڈھے پر بیٹھتے، اور دونوں پیر کھٹولے پر رکھ لیتے۔ ایک تختی پر چٹکی سے کاغذ لگے ہوتے۔ تختی ہاتھ میں لیتے ہی وہ اپنے خول میں چلے جاتے۔ اب بچوں کا شور و غل، چیخ پکار کوئی ان پر اثر نہیں کر سکتی تھی۔ عام طور پر اپنے مسودے خود صاف کرتے۔ جب تک سلمیٰ صدیقی کی شادی نہیں ہوئی تھی، کبھی کبھی یہ خدمت اُن سے لی جاتی تھی۔ اور انھیں اس کا معاوضہ دو آنے فی صفحہ کے حساب سے دیا جاتا تھا۔

رشید صاحب نے ہمیں بی اے میں دو سال پڑھایا ہے۔ وہ وقت کے بہت پابند تھے۔ ادھر گھنٹہ بجا، اُدھر ظہور وارڈ کی طرف سے ان کی رکشا آتی ہوئی نظر آئی۔ کسی کی طرف دیکھے بغیر سیدھے جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے، رجسٹر کھول کر حاضری لیتے، رجسٹر بند کرتے، اور دیوانِ غالب کھول لیتے، اور پڑھائی شروع ہو جاتی۔ کلاس کے دو دلچسپ واقعات میرے ہم جماعت ڈاکٹر اسلم پرویز نے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں نقل کیے دیتا ہوں:

> رشید صاحب کے پڑھانے کا دستور یہ تھا کہ وہ بات کرنے کا موقع کم ہی
> دیتے تھے، اور اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں، جو کورس سے متعلق ہو
> سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے بڑے غور و فکر کے بعد ایک سوال
> رشید صاحب سے دریافت کرنے کے لیے تیار کیا۔ سوال یہ تھا، "کیا
> غالب فلسفی تھے؟" حسبِ دستور رشید صاحب تشریف لائے، حاضری
> لی اور حاضری کے رجسٹر پر سے نگاہ اُٹھائے بغیر اس پر دیوانِ غالب
> رکھ کر کھول لیا۔ لیکن اس سے قبل کہ رشید صاحب اپنا لکچر شروع کریں،

ایک طالبعلم نے ہمت کر کے کہا: مجھے ایک سوال دریافت کرنا ہے! رشید صاحب نے گویا دیوانِ غالب ہی میں سے پڑھتے ہوئے جواب دیا: فرمائیے۔ طالبعلم نے کہا: سوال یہ ہے کہ کیا غالب فلسفی تھے؟ رشید صاحب نے اسی انداز اور لب و لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اور جواب کا سلسلہ لکچر سے ملاتے ہوئے فرمایا: جی ہاں، غالب فلسفی تھے۔ صفحہ بیالیس نکال لیجیے۔

ایک اور مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید صاحب کلاس میں حاضری لے رہے تھے۔ حاضری لیتے وقت ایک نام پکارا: وسیم فاضلی۔ پہلی مرتبہ اس نام پر آج "یس" کی آواز آئی، اور رشید صاحب نے بھی غالباً پہلی مرتبہ نیت توڑ کر نگاہ اٹھائی، اور "یس سر" کہنے والے صاحب سے کہا: حضرت! اب تک نیاز کیوں نہ حاصل ہو سکے؟ انھوں نے جواب دیا "بدنصیبی ہے" رشید صاحب نے پھر برجستہ سوال کیا: کس کی۔ آپ کی یا میری۔

عورت کے معاملے میں وہ مشرقیت کے قائل ہیں۔ عورت کا اچھال چھکا پن انھیں قطعی پسند نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ عورتوں کی زبان بہت فصیح اور درست ہونی چاہیے۔ اگر عورتیں الفاظ کا تلفظ غلط کریں، تو ناقابلِ معافی ہیں۔ وہ خوش خلقی کو بھی زنانیوں کے سلیقے میں شمار کرتے ہیں۔ بعض الفاظ انھیں عورتوں کے منہ سے سخت ناگوار گزرتے ہیں۔ مثلاً السّلام علیکم، لاحول ولا قوۃ وغیرہ۔

ان کی پسند اور ناپسند دونوں ہی شدید ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ان کے رویے میں شدید ترین جذباتیت ہوتی ہے۔ جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اردو کے بارے میں لکھتے ہیں: "اردو جاننا اور علیگڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علیگڑھ بھی ہے۔" "میں سمجھتا ہوں کہ سیرت پاک پر خطباتِ احمدیہ سے بہتر کوئی دوسری تصنیف سر سید سے پہلے نہیں ملتی۔" یا اردو ہی کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "اردو ایک قیمتی ورثہ، ایک قابلِ قدر روایت، ایک نادر آرٹ، ایک سحر کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا وغیرہ" ذاکر صاحب

کے بارے میں لکھتے ہیں : " ڈاکر صاحب کو کوئی بُرا کہتا ہے، تو بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو یہ شخص شیطانِ محض ہے، یا ناواقفِ محض " اسی جذباتیت کا اظہار علیگڈھ سے ان کی محبت میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر لکھ رہے ہوں، اس میں علیگڈھ یا علی گڈھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور آجائیگا۔ علیگڈھ سے ان کے اس جذباتی رشتے کے تجزیے کے لیے ہمیں ان کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات پیش نظر رکھنا ہونگے۔

رشید صاحب جون پور کے ایک قصبے مڑیاہوں میں پیدا ہوئے تھے ان کی ابتدائی تعلیم مڑیاہوں اور پھر جونپور میں ہوئی۔ جہاں سے انھوں نے انٹرنس پاس کیا تھا۔ جونپور ایک تاریخی شہر ہے۔ شاہانِ شرقی نے اسے غیر معمولی علمی اور تہذیبی اہمیت کا حامل بنادیا تھا۔ رشید صاحب نے جب ہوش سنبھالا، تو یہ سب کچھ ختم ہوئے عرصہ ہوچکا تھا، لیکن عظیم الشان مسجدوں، مزاروں، مقبروں، قلعے، پل، اور نجانے کتنی عمارتوں کے کھنڈر زبانِ حال سے شاہانِ شرقی کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ تہذیبی سطح پر جاگیرداری قدریں ابھی تک زندہ تھیں۔ اس دور کے جون پور کا ذکر کرتے ہوئے " آشفتہ بیانی میری " میں رشید صاحب لکھتے ہیں:-

> اب سوچتا ہوں، اس زمانے کا جون پور علم وفضل اور شاعری و شرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابلِ قدر خطہ تھا۔ بیشتر مسلمان گھرانے ایسے تھے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

ایک اور جگہ جونپور کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبا کے رشتہ داروں کے بارے میں لکھتے ہیں :

> یہ لوگ قدیم تہذیب اور وضعداری کا نمونہ ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شفقت اور دلچسپ انداز سے سناتے اور اخلاق و تہذیب کے حدود میں

رہنے کی نصیحت اس پیرایے میں کرتے، کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا۔ دوسرے لفظوں میں جاگیرداری نظام کی بہترین، صالح اور صحتمند اقدار نے رشید صاحب کی ذہنی ساخت میں نمایاں حصّہ لیا۔ رشید صاحب طالب العلم کی حیثیت سے جس علیگڈھ آئے تھے، وہ آج کے علیگڈھ سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت وہاں اکثریت ان طلبا کی تھی، جن کا جاگیرداری طبقے سے تعلق تھا۔ اسی علیگڈھ نے ان کی تعمیر شدہ شخصیت کو تب و تاب اور رنگ و آہنگ دیا۔ چونکہ علیگڈھ ان تمام اعلیٰ و ارفع اقدار کا حامل تھا، جو رشید صاحب کو عزیز تھیں، اس لیے جونیور نے رشید صاحب کے ذہن میں علیگڈھ کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رشید صاحب کو جو والہانہ عشق ایم، اے، او کالج سے تھا، وہ یونیورسٹی سے نہیں ہو سکا۔ ان کے خیالوں کی دنیا میں جدید علیگڈھ کی عظیم الشّان عمارتوں کے پس منظر میں وہ کچّی بارک ابھرتی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے کبھی لکھا تھا کہ:

> باوجود طرح طرح کی تکالیف اٹھانے کے ایک متنفّس نے کبھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچّی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچی بارک میں جگہ مل جائے۔"

بہت کم لوگ ایم، اے، او کالج کے بارے میں ان کی اس عقیدتمندانہ رائے سے اتفاق کرینگے کہ "مسلم یونیورسٹی ایم، اے، او کالج سے برآمد ہوئی۔ لیکن بوجوہ وہ اتنی ہونہار اور شاندار ثابت نہیں ہوئی، جتنا کہ ایم اے او کالج تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہ ان روایات کو برقرار نہ رکھ سکی جو کالج کی ناموری کا باعث تھیں۔" مسلم یونیورسٹی کو وقت کے تقاضوں نے جنم دیا تھا۔ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق وہ بدلتی رہی ہے۔ ایم اے، او کالج کی بیشتر اقدار جاگیرداری طبقے کی تھیں۔ اس کے برعکس یونیورسٹی پر برطانوی تہذیب اور تمدّن کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں۔ اس لیے یہاں کی اقدار بدل رہی تھیں ظاہر ہے کہ جاگیرداریت کی بہترین اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے انسان کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ایسا شخص ہی یہ بات کہہ سکتا تھا کہ

> انسان کی صالح و صحتمند زندگی کا مدار اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی کیا اہمیت ہے؛ اور ان اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ یہ اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔

جونپور اور اس کی اقدار طرح طرح کے بھیس بدل کر رشید صاحب کی زندگی میں آتے ہیں۔ کبھی یہ ایم اے او کالج کی شکل میں، کبھی ذاکر صاحب، کبھی غالب، کبھی اردو اور تاج محل اور کبھی سراج ہیرا۔ رشید صاحب کرکٹ میچ، مشاعرہ اور یونیورسٹی یونین میں بھی۔ انہیں اقدار کی تلاش کرتے ہیں۔ انھوں نے ان تمام لوگوں، اداروں اور تقریبوں کے لیے، جو توصیفی کلمات استعمال کیے ہیں، انھیں میں نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر یکجا کر لیا ہے۔ وہ الفاظ اور کلمات یہ ہیں: ایمانداری، شائستگی، شرافت، انسان دوستی، علمیت، قابلیت، شعر و شاعری کا شوق، کلاسیکی ادب پر عبور، وضعداری، خوش گفتاری، خوش لباسی، علم مجلس، خوش اطواری، فقرے بازی، عاجزی و خاکساری، قناعت، قربانی و ایثار، حق پرستی، بیباکی، دوست نوازی، خلوص، وسیع المشربی، دردمندی، عالی حوصلگی، خود اعتمادی، حق پرستی، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت اور شفقت، اسپورٹس مین شپ وغیرہ۔ یہ تمام خصوصیات جاگیرداریت کی بہترین اقدار کا حصہ ہیں، اور رشید صاحب انھیں وہ اپنے علیگڈھ اور ذاکر صاحب کی ہستی میں متشکل دیکھتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھیں در اصل ان اقدار کے مداح ہیں۔ جہاں کہیں بھی اور جس چیز میں بھی ان اقدار کی جھلک نظر آتی ہو، وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔

رشید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ مکتوب نگاری رہا ہے۔ علیگڈھ کے حضرات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو کہ آپ انھیں کتنا ہی ضروری خط لکھیں، وہ جواب نہیں دینگے۔ لیکن رشید صاحب علیگڈھ کی اس روایت کے باغی ہیں۔ ممکن نہیں کہ رشید صاحب سے دو تین دن میں آپ کو اپنے خط کا جواب مل جائے، حال آں کہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے، جس کا اظہار ان کی تحریر سے ہوتا ہے۔ بالعموم رشید صاحب خط پوسٹ کارڈ

پر لکھتے ہیں۔ اگر خط کا مضمون طویل ہوا تو عبارت کو غیر معمولی حد تک خفی کردیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ادیب نہ ہوتے، تو چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھنے کے ماہر ہوتے؛ ان کے خط ہمیشہ دلچسپ اور پُرلطف ہوتے ہیں۔ کیسا ہی کاروباری خط کیوں نہ ہو، اس میں ایک آدھ پُرمزاح جملہ ضرور ان کے قلم سے نکل جاتا ہے۔ آل احمد سرور نے ان کی مکتوب نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

> ان کی باتوں سے زیادہ ان کے خط دلچسپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو جو خط لکھتے ہیں، ان میں مختلف اشخاص یا واقعات پر بڑے پُرلطف تبصرے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہو کہ ان کی شخصیت کا سب سے بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے، نہ قلمی خاکوں میں، نہ تنقید میں، نہ ان کے دوسرے مضامین میں ہو، بلکہ ان کے خطوں میں ہے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب کے خطوط کے مطالعے کا موقعہ ملا ہے، وہ سرور صاحب کی اس رائے سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ "جب رشید صاحب کے خطوط شائع ہونگے، تو غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایہ میں سب سے بڑا اضافہ ہوگا۔ غالب کی طرح رشید صاحب کی زندگی کا دارومدار بھی اب مکتوب نگاری پر ہے۔ ان کے بچے ہندستان اور ہندستان سے باہر ہیں۔ ان بچوں اور دوستوں کے خطوط کے لیے ان کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ خط ملتے ہی وہ اس کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس مشغلے میں ان کا اچھا خاصا وقت گزر جاتا ہے۔

رشید صاحب کبھی دوستوں کی محفلوں کی جان تھے۔ ان کی فقرہ بازی محفلوں کو زعفران زار بنا دیتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے عزیز دوست ان سے جدا ہوتے گئے۔ بچے جو گھر کی رونق تھے، وہ بھی جوان ہو کر زندگی کی تگ ودو میں مصروف ہو گئے۔ رشید صاحب نے پہلے خود کو علیگڑھ میں، پھر گھر میں، بالآخر گھر کے ایک کمرے میں بند کرلیا۔ اب ان کی ساری دنیا سمٹ کر یہ کمرہ، کچھ کتابیں، رسائل اور لکھنے پڑھنے کا سامان ہو کر رہ گئے ہیں۔

مالک رام

حیاتِ رشید

"حضرت، آپ کا سالِ ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۶ء، کوئی ۱۸۹۴ء؛ ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟"

"۱۸۹۲ء"

"کیا مہینا؟"

"دسمبر"

"تاریخ؟"

"۲۴"

"سبحان اللہ! آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے؟"

چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص انداز میں کھل کر مسکرا دیے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے، یہ گفتگو میرے اور جناب رشید احمد صدیقی مدظلہ کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے؛ مہینا غالباً مئی کا تھا۔

تو یہ طے ہو گیا کہ قبلہ رشید احمد صدیقی کی تاریخِ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے بہت دن بعد انھوں نے پھر ایک مرتبہ بتایا کہ انھیں اپنے پرانے کاغذوں میں کسی اور عزیز کی کوئی یادداشت ملی تھی، اس میں بھی یہی تاریخِ ولادت درج تھی۔

مشرقی اتر پردیش کے ضلع جونپور کا ایک قصبہ مریاہو[۱] ہے۔ یہ جونپور سے ۱۱ میل دُور ہے اور تحصیل کا صدر مقام بھی۔ حضرت پیر دکریا دادا کا مزار یہاں کا بہت مشہور زیارتی مقام ہے۔ اب تو تعلیم کا رواج عام ہو گیا ہے، اور لوگ، خاص کر تعلیم یافتہ لوگ، ہر ایک چیز کے انکار اور روایت شکنی ہی کو روشن خیالی کی دلیل سمجھنے لگے ہیں، پہلے مریاہو میں شادی بیاہ کے موقع پر یہ مسلّمہ رواج تھا کہ دولہا پہلے اس مزار پر سلام کے لیے حاضری دیتا، سلام کر کے نذر پیش کرتا، اور اس کے بعد بارات روانہ ہوتی۔ ان بزرگ کے اخلاف جس محلّے میں مقیم ہیں، وہ آج بھی محلّہ پیر دکریا کہلاتا ہے۔

یہی حضرت پیر دکریا ہمارے رشید صاحب کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ سترہویں صدی عیسوی میں تبلیغِ دین کی غرض سے ترکستان سے ہندستان آئے تھے۔ پہلے چند دن پنجاب میں قیام کیا۔ جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا، تو دلّی اور الٰہ آباد ٹھہرتے ہوئے جونپور پہنچ گئے، اور بالآخر مریاہو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی، اور بیشتر نے فوج اور سپہگری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انھیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدّیقی صاحب کے والد جناب عبدالقدیر صاحب پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ دنوں بلیا اور غازی پور اور جونپور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ قیامِ جونپور کے آخری زمانے میں وہ کوتوالِ شہر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور، بلکہ بہت حد تک بجا طور پر، بدنام ہے، لیکن عبدالقدیر صاحب کی نیکی اور دینداری کا شہرہ تھا۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند، اور مشہور زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ف ستمبر ۱۸۹۵ء) کے مرید تھے۔ اسی سے ان کے عام رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

عبدالقدیر صاحب کا نکاح بھدوہی (ضلع بنارس) کے سیّد باسط علی کی صاحبزادی

---

[۱] اس لفظ کے تلفّظ کے بارے میں یقین نہیں ہے۔ اسے مختلف طریقے سے لکھا گیا ہے: مَڑیاہوں، منڈیاہوں، مُنڈدِدیہ، منڈدی آہو۔ خدا معلوم مقامی لوگ کیسے لکھتے اور بولتے ہیں!

سے ہوا تھا۔ ان کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں: سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔

جناب عبدالقدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بیریا (ضلع بلیا) میں تعینات تھے، جب خدا نے انھیں دوسرا بیٹا دیا جس کا نام انھوں نے رشید احمد رکھا۔ یہی ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان سے بڑے بھائی عبدالصمد صاحب وکیل تھے؛ ان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے جناب نیاز احمد صدیقی ابھی حال تک محمد حسن کالج، جونپور کے پرنسپل تھے، بفضلہٖ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں رحلت کر گئے تھے۔

رشید احمد صدیقی صاحب اپنے بچپن میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ طرح طرح کے علاج معالجے اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، لیکن ان کی علالت کا سلسلہ بہت دن تک چلا۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی کیونکہ اندیشہ تھا کہ جسمانی کمزوری کے باعث یہ ذہنی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔

جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے شریف گھرانوں کا دستور تھا، ان کی تعلیم بھی گھر ہی پر، اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اس دور میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں، عربی کے چند رسالے، دینیات کے کچھ اسباق اور قرآن شریف پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے، تو اردو اور حساب، پہاڑے وغیرہ سیکھنے کو مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں جو مدرس انھیں اردو پڑھاتے تھے، وہ خود اردو سے بالکل نابلد تھے، اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط کر لینے تک محدود تھی۔

اگرچہ ان مدرس کو نہ پڑھنے سے کچھ تعلق تھا، نہ پڑھانے سے؛ اور مذہباً بھی وہ کٹر قسم کے برہمن تھے، لیکن بحیثیت انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادم خلق اور ہمدرد۔ جب وبائی طاعون کا موسم آتا (اور یہ ہر سال ہی آتا تھا) تو مدرسہ اپنی عمارت سے اٹھ کر گاؤں کے مندر میں منتقل ہو جاتا۔ ماسٹر صاحب کی روزانہ کی صحبت اور سال بسال اس مندر میں مہینوں بسر کرنے، بلکہ مندر کے بعض چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ

رشید صاحب کے دل میں ہندو دھرم، بلکہ تمام دوسرے مذاہب کے لیے رواداری کے جذبات پیدا ہوگئے، اور خوشگوار لینت اور نرمی، تحمل اور بردباری ان کے مزاج کے گویا اجزائے ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، جونپور بھیجا گیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ یہ سند تو انھوں نے جوں توں حاصل کرلی، لیکن ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ جہاں اور تمام مضامین میں ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہا، ریاضی میں یہ ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں ریاضی اور حساب کتاب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ غرض اب سوال تھا آیندہ کا، لیکن چونکہ یہ جونپور کا تشکیلی دوران کی بقیہ زندگی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے پہلے اس کے اثرات و نتائج سے متعلق چند لفظ لکھنا بےمحل نہ ہوگا۔

جونپور کو "شیرازِ ہند" کہا گیا ہے، اور واقعی وہ اس نام کا مستحق تھا۔ شاہانِ شرقی کے عہد میں اس نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقی کی، اس کے آثار آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ حکومتِ وقت کی نگرانی نے جونپور میں یگانۂ روزگار علماء و فضلا کو جمع کردیا تھا۔ وہ آئے اور انھوں نے یہاں مدارس و مکاتب کھول دیے، رشد و ہدایت کی مجلسیں قائم کردیں۔ اور یوں ہر طرف علم اور اس کی تمام شاخوں کا چرچا عام ہوگیا۔

حکومت نے شہر کی ظاہری تزئین و تہذیب پر بھی خاص توجہ کی۔ عالیشان عمارات، مساجد، مقابر، سرائیں جو اُس زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں سے بیسیوں کی باقیات آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سطوت و جلالِ ماضی کے یہ سب آثار رشید احمد صدیقی نے دیکھے۔ ان کا اپنا خاندان بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا؛ ان کی ابتدائی گھریلو تعلیم بھی بیشتر مذہبی نوعیت کی تھی؛ طبیعت بھی حساس اور درد مند اور غور و فکر کی عادی تھی۔ اس پر جونپور میں جن ساتھیوں سے، اور ان کے واسطے سے ان کے خاندانوں سے، تعلق پیدا ہوا، وہ بھی اسی کا روان رفتہ کی یادگار تھے۔ جاگیرداری نظام میں لوگ لاکھ کیڑے ڈالیں، لیکن اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کرنا بھی قرینِ انصاف نہیں۔ ادب آداب کی پابندی، رکھ رکھاؤ

کے طریقے، بزرگوں کی شفقت اور ان کا خردوں سے محبت سے پیش آنا، اس دور کا مابہ الامتیاز تھا۔

جونپور میں بیشتر پرانے گھرانے شیعہ عقائد کے تھے رشید صاحب کے ساتھ پڑھنے والے انھیں خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ یہ ان کے گھروں پر جاتے۔ ان سے محبت اور شفقت کا سلوک تو ہونا ہی چاہیے تھا؛ اس کے ساتھ وہاں انھیں شعرا کا کلام، مرثیے اور سوز اور سلام سننے اور پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی اردو دوستی کی بنیاد پڑی اور اُردو ادیب بننے کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسطِ شہر میں دریائے گومتی بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک وہ منزلہ عادت میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا۔ رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتب خانے میں جاتے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے اور اردو انگریزی کے ناول اور افسانے پڑھا کرتے۔ یوں رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کر دی۔ اور وہ اُردو ادب کے خاصے بڑے حصے سے واقف ہو گئے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب سے بےتکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ معنوی پہلو سے ان کے شوق و شغف کے موضوع تین رہے ہیں:۔ اسلامیت؛ پرانی اقدار و تہذیب؛ اُردو۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیامِ جونپور کے زمانے میں پڑی تھی۔ بعد کو وسیع ذاتی مطالعے اور دوست احباب سے تبادلۂ خیالات، نیز تہذیب کے انحطاط اور نئی نسل کی اخلاق باختگی کے نظارے سے ان میں ان موضوعات کے زمانۂ حال سے تقابل اور اُن کے بارے میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی۔

غرض جونپور کے یہ تین چار سال ان کی زندگی اور ذہنی نشو و نما کے مطالعے کے لیے بہت اہم زمانہ ہے۔

جونپور گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد اب مستقبل کا مسئلہ درپیش تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کر سکتی۔ مجبوراً نوکری کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے اس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑا؛

وہیں جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک مقرر ہو گئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ ۱۵ - ۲۰ روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازم اور گھر کا کما ؤ فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے، لیکن رشید صاحب خود اس سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد وہ رسّی تڑا کر بھاگ نکلے اور علیگڈھ کا رخ کر دم لیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

اسکول کے زمانے میں انھیں کھیل کود کا لپکا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے پسند کھیل تھے اور وہ اپنے اسکول کی ان تینوں ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڈھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیل کود پر خاص توجہ تھی اور یہاں کے طلبہ کی اس میدان میں دور دور شہرت تھی۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، رشید صاحب دراصل علیگڈھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے، جتنا یہاں کے کھیل کا چرچا سن کر۔ لیکن یہاں ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوا، اُس زمانے میں یہاں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انھوں نے ٹینس پر توجہ کی، اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا کر لی۔ کھیلوں میں انھیں برج کا بھی شوق رہا ہے۔

علیگڈھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک؛ ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں کے طلبہ کو وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا اور وہیں جا کر امتحان دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیے تھے۔

طالبعلمی کا دور مالی پہلو سے بہت پریشان کن رہا۔ والد پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور ان کی پنشن ایک بڑے کنبے کی ذمہ داریوں کے ساتھ، ان کی تعلیم کے مصارف بھی برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی لمبی تعطیلات میں نوکری سے اتنا کما لاتے، کہ یہ تنگی ترشی سے سال بھر کے خرچ کے لیے کفایت کرتا۔ کالج میں ۱۵ جولائی سے ۱۵ اکتوبر تک، تین مہینے گرمی کی چھٹیاں

ہوا کرتی تھیں۔ یہاں ایام میں بنارس جاتے اور وہاں دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر مسلوں کی نقل کرنا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا، کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوشخط بھی۔ یہ "مشقت" پانچ برس تک جاری رہی۔ جس صبر و شکر سے انھوں نے یہ زمانہ بسر کیا، اور جس آن بان سے انھوں نے ہمچشموں میں اپنا سر اونچا رکھا، وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

علیگڑھ ایم، اے او کالج محض ایک درسگاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگ میل، اور ہندستانی مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے نونہالانِ قوم جمع ہوتے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے، تو قدرتی طور پر وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصہ بن گئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی ساری تعلیم و تربیت نہ صرف علیگڑھ کی روایات کے منافی نہیں تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ معراج ہونا ہی علیگڑھ چاہیے تھا۔

علیگڑھ میں رشید صاحب کے حلقۂ احباب میں اقبال احمد خاں سہیل (ف نومبر ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔ سہیل اردو فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر اور غیر معمولی طور پر ذہین و فطین شخص تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال تک ساتھ رہا؛ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ من تو شدم، تو من شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلا خوفِ تردید و شبہہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کی تصنیفی صلاحیتوں کے ابھارنے اور اجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ رشید صاحب اپنے جونپور کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاہ نذیر غازیپوری اس زمانے کے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے نوجوان رشید صاحب کی رہنمائی کی، اور انھیں ادب میں راہِ راست پر لگا دیا۔ علیگڑھ آئے، تو یہاں سہیل نے انھیں اس اسلوبِ تحریر کی راہ دکھلائی، جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج یونین کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور پھر "علیگڑھ منتھلی" (کالج کا سرکاری جریدہ) کے مدیر۔ یہ ماہانہ دو زبانوں (انگریزی اور اردو) میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے کہنے پر اس کا نام "منتھلی" سے بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصّوں کے الگ الگ مدیر اسٹاف میں سے ہوا کرتے تھے، پہلی مرتبہ انگریزی اور اردو دونوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالبعلم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصّوں کے مضمون لکھا کرتے تھے۔ اردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں "لوہین" (آوارہ گرد) کے نام سے۔ یہیں ہی نے انھیں سب سے پہلے طنزیہ مضامین لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام "کمپ بارک" نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین "بگل منزل" کے عنوان سے لکھا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) قائم تھی۔ اسے سرسید کی زندگی ہی میں، صاحبزادہ آفتاب احمد خان (ف جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار، لیکن ہونہار طلبہ کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو وفود بیسہ جمع کرنے کو باہر جائیں وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن تھے۔ اس انجمن کے وفد ہر سال چھٹیوں کے ایام میں ملک کا دورہ کرتے تھے۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۷ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں میمیو تک کا سفر کیا۔ واپسی پر انھوں نے "سیاحتِ برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے، جو میگزین میں شائع ہوئے تھے۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط و کتابت بھی بہت حد تک رشید صاحب کے سپرد تھی۔ نیز مختلف مباحث اور موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے۔ اس سے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسے پختگی پیدا ہو گئی ۔

کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں ایک اور بات نے بھی ان کی مدد کی ۔ ان کے انگریزی کے مدرس انعام اللہ خان صاحب تھے ۔ وہ اپنے عہد کے بہت ممتاز اور ماہر انگریزی دان سمجھے جاتے تھے ۔ لیکن انگریزی ایسی مرصّع اور مسجّع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ۔ رشید صاحب پروفیسر انعام اللہ خان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے ۔ ان کے بیشتر انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہے ۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر ۱۹۲۱ء میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے ۔ یہ عہدہ اس زمانے میں "اردو مولوی" کہلاتا تھا ۔ اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی ۔ اور معلوم نہیں تھا کہ اصحابِ مجاز کس دن ۔ کس بات سے ناراض ہو کر نکال باہر کر دیں ۔

اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرر کی جگہ نکلی، تو انھوں نے بھی درخواست دی ۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے ۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی ۔ اس پر اتمامِ حجت کے لیے انھوں نے مقالہ "طنزیاتِ مضحکات" لکھا ۔ جو پہلے ہندستانی اکیڈمی ، الہ آباد کے تماہی رسالے ہندستانی میں بالاقساط چھپا اور پھر کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا ۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا ، اور یہ عارضی طور پر مقرر ہو گئے ۔ بڑے جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۶ء میں وہ مستقل لیکچرر (اردو) مقرر ہوئے ۔ منجملہ اور اصحاب کے علامہ اقبال نے بھی ان کی سفارش کی تھی ۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے ؛ اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر ، جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے ۔ یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے ۔ جب سے آج تک علیگڑھ میں مقیم ہیں ۔ یہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا ۔

اپنی طالبعلمی کے زمانے میں اللہ کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے ملی، جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آچکے تھے، بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اس بات پر افسوس کیا کرتے کہ اُردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں اور پھر خود ایک بہترین رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتب کرتے۔ دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل" کہ دونوں میں روشنی کا تصوّر ہے، اور نہ صرف خود روشن ہیں، بلکہ اپنے چاروں طرف بھی نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا مقصد اور معیار کتنا بلند تھا۔ تو خیر، ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف جون ۱۹۷۱ء) نے بعض احباب کے تعاون سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام شمع رکھ دیا۔ رشید صاحب نے اس کا افسوس کیا کہ وہ جو دو ناموں میں کسی ایک کے انتخاب کرنے میں لذّت تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ لیکن انھیں اطمینان تھا کہ خیر، 'سہیل' تو ہے ہی؛ جب پرچہ جاری کریں گے، اس کا یہ نام رکھ لیں گے۔ اس زمانے میں سیّد سجاد حیدر یلدرم (ف اپریل ۱۹۴۳ء) یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ اردو میں اچھے پرچے کم ہیں، ایک پرچہ 'سہیل' کے نام سے نکالنے کا خیال ہے، تو یلدرم مرحوم نے کہا، کہ ہاں یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے"۔ رشید صاحب یہ سُن کر گھبرائے کہ 'شمع' تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، اگر یلدرم نے 'سہیل' پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے؛ ذاکر صاحب بھی یورپ میں ہیں، ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔

سہیل انجمن اردوئے معلی، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے آغاز میں جاری ہوا۔ لیکن آج تک کسی اچھے پرچے کو اِلّا ماشاءاللہ اردو دانوں اور اردو حلقوں کی فضا راس نہیں آئی، نہ ان کا تعاون ہی حاصل ہوا۔ یہی حشر 'سہیل' کا بھی ہوا باوجود اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت و طباعت، دیدہ زیب شکل و صورت کی تعریف کی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے، اور وسط ۱۹۲۷ء

میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔

رشید صاحب نے اس پر بھی ہار نہیں مانی ۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انھوں نے پھر اسے جاری کیا ۔ اب کے اعلان کیا کہ یہ ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع ہوا کریگا۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کا یہ شمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔

رشید صاحب آج بجا طور پر اُردو ادب کے مسلّمہ اور مایۂ ناز نثر نگار، اور طنز و مزاح کے منفرد مصنّف ہیں۔ انھوں نے اپنے بیشتر مداحوں اور پڑھنے والوں کو خوش وقت کیا ہے! ان کی زندگی کی اداس اور بے کیف گھڑیوں کو مسرّت و انبساط سے رنگین کیا ہے۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن ہیں، لیکن انھوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا سلیقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ یوں اگر ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے، تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو متھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لیں، تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیت سو مرتبہ قربان کی جا سکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔

ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدر، اور خود ان سے ملک کے اہل علم و فن طبقے نے جو محبت کی ہے، اسی کی ادنیٰ باز گشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے، جس سے حکومت ہند نے انھیں یوم جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔

میں یہاں رشید صاحب کے فن سے متعلق کچھ نہیں لکھونگا۔ اسی شمارے میں آپ کو بعض اہل نظر کے مضامین، ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ملینگے۔ یہاں میں ان کی مصنّفات اور مضامین کی ایک مختصر اور نامکمل فہرست بطور ضمیمہ پیش کر رہا ہوں، جس کی ترتیب کے لیے میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب کا ممنون ہوں:

ضمیمہ

کتب

۱۔ طنزیات و مضحکات	ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد	
۲۔ مضامینِ رشید	مکتبۂ اردو، دلّی	:(۱۹۳۱، ۱۹۴۲، ۱۹۶۴ء)
۳۔ خنداں	مکتبۂ جامعہ نئی دلّی	۱۹۳۰ء (۱۹۶۵ء)
۴۔ سہیل کی سرگزشت	نفیس اکیڈمی، حیدر آباد	۱۹۴۷ء
۵۔ گنجہائے گراں مایہ		:(۱۹۵۱ء، ۱۹۶۲ء)
۶۔ ذاکر صاحب	کتابی دنیا لمیٹڈ، دلی	
۷۔ ہمارے ذاکر صاحب	مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی	۱۹۷۳ء (نمبر ۶ پر اضافہ)
۸۔ جدید غزل	مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ	:۱۹۵۵ء (۱۹۵۸ء)
۹۔ شیخ نیازی	سرسید بک ڈپو، علیگڈھ	:۱۹۵۸ء
۱۰۔ آشفتہ بیانی میری	مصنف، علیگڈھ	(۱۹۵۸ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۳ء)
۱۱۔ ہمنفسانِ رفتہ	انڈین بک ہاؤس، علیگڈھ	۱۹۶۶ء (۱۹۷۱ء)
۱۲۔ عزیزانِ ندوہ کے نام	دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ	
۱۳۔ علیگڈھ کی مسجدِ قرطبہ	مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ	۱۹۶۷ء

۱۴۔ غالب کی شخصیت اور شاعری شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی، دلی ۱۹۷۰ء
۱۵۔ علیگڑھ : ماضی و حال مسلم یونیورسٹی؛ علیگڑھ ۱۹۷۰ء

خطبات

۱۶۔ خطبۂ صدارت، اردو کانفرنس، بریلی : ۱۹۴۰ء (نگار، لکھنؤ : ستمبر ۱۹۴۰ء)
۱۷۔ اصلاح زبان و مصطلحات اردو
(خطبۂ صدارت، کل ہند اردو کانفرنس،
حیدرآباد، ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء) : (ادبی دنیا، لاہور : ستمبر ۱۹۴۴ء)
۱۸۔ خطبۂ صدارت، کل بہار ریاستی اردو
کانفرنس، پٹنہ : ۱۲۔۱۴ مئی ۱۹۵۱ء : (علیگڑھ میگزین : ۱۹۵۱۔۱۹۵۲ء)
۱۹۔ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد، جامعۂ ملیہ اسلامیہ،
۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء : (جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، نئی دلی : ۱۹۶۸ء)
۲۰۔ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد، جامعۂ اردو، علیگڑھ :
۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء : (جامعۂ اردو، علیگڑھ : ۱۹۷۳ء)

مقالات :

۲۱۔ خصوصیاتِ کالج : گل منزل (۱) : علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ : ستمبر ۱۹۱۷ء
۲۲۔ خصوصیاتِ کالج : گل منزل (۲) : علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ : اکتوبر ۱۹۱۷ء
۲۳۔ خصوصیاتِ کالج : گل منزل (۳) : علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ : دسمبر ۱۹۱۸ء
۲۴۔ خصوصیاتِ کالج : گل منزل (۴)ؔ : علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ : اگست/اکتوبر ۱۹۱۹ء
۲۵۔ قہرِ درویش : علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ : نومبر/دسمبر ۱۹۲۱ء
۲۶۔ فلسفۂ ازدواج : الناظر، لکھنؤ : جنوری ۱۹۲۴ء

ؔ یہ مضامین علیگڑھ میگزین (انتخاب نمبر) ۱۹۷۱ء میں بھی شامل ہیں

۲۷۔ مشترکہ شعر و ادب :	کانفرنس گزٹ، علیگڑھ	: یکم دسمبر ۱۹۳۹ء
۲۸۔ مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیالات :	نگار، لکھنؤ	: جولائی ۱۹۴۰ء
۲۹۔ دو باتیں تفنن :	اجمل (روزنامہ) بمبئی	: ۹ فروری ۱۹۴۱ء
۳۰۔ اپنی یاد میں :	علیگڑھ میگزین، علی گڑھ	: مارچ ۱۹۴۴ء
۳۱۔ زندگی کی پریشانیاں، چٹکی :	آجکل، دہلی	: ۱۵ مئی ۱۹۴۶ء
۳۲۔ سویرے جو آنکھ کھلی :	ساقی (سالنامہ)، دہلی	: جنوری ۱۹۴۷ء
۳۳۔ ایڈیٹوریل :	کانفرنس گزٹ، علی گڑھ	: ۱۶ جنوری ۱۹۴۷ء
۳۴۔ قسمیں کھانا :	نیا ہندستان (ہفت روزہ) بمبئی	: ۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء
۳۵۔ جھگڑا الو	نگار، لکھنؤ	: مارچ ۱۹۴۹ء
۳۶۔ اشتہار بازی :	نگار، لکھنؤ	: مئی ۱۹۵۰ء
۳۷۔ دھوبی :	محمد حسن کالج میگزین، جونپور	: اپریل ۱۹۵۱ء
۳۸۔ آجکل کے نقاد :	نگار، لکھنؤ	: اگست ۱۹۵۱ء
۳۹۔ حسن آفریں، مرحبا، مرحبا :	علیگڑھ میگزین (طنز و مزاح نمبر) علیگڑھ	: ۱۹۵۳ء
۴۰۔ غالب : ایک صاحبِ طرز انشا پرداز :	ہندستانی ادب، حیدرآباد	: مئی ۱۹۵۵ء
۴۱۔ اکبر الہ آبادی :	آئینہ (ہفت روزہ)، نئی دلّی	: ۸ اگست ۱۹۵۵ء
۴۲۔ کچھ فسادِ عجائب کے بارے میں	نقوش، لاہور	: اکتوبر ۱۹۵۶ء
۴۳۔ نیا سال اور پامال اشعار :	مجلّۂ عثمانیہ، حیدرآباد	: ۵۸-۱۹۵۷ء
۴۴۔ سرگزشتِ عہدِ گل :	ادیب، علی گڑھ	: جنوری ۱۹۵۹ء
۴۵۔ کندن :	آجکل، نئی دلی	: جنوری ۱۹۶۰ء
۴۶۔ اردو نثر کا بنیادی اسلوب	فکر و نظر (سہ ماہی) علیگڑھ	: جنوری ۱۹۶۰ء
۴۷۔ جگر صاحب :	نقوش (ادبِ عالیہ نمبر)، لاہور	: اپریل ۱۹۶۰ء
۴۸۔ تری یاد کا عالم :	فکر و نظر، علیگڑھ	: اکتوبر ۱۹۶۰ء
۴۹۔ جامعہ کی دوسری جوبلی :	جامعہ، نئی دلّی	: جنوری ۱۹۶۱ء

۵۰۔ خودکشی علیگڑھ میگزین، علیگڑھ : مارچ اپریل ۱۹۳۲ء

۵۱۔ پیر جیرا احسو نے اپنا قصہ : فکر و نظر (سہ ماہی) علیگڑھ : جولائی ۱۹۶۳ء

۵۲۔ کہاں ہو آج تو، اے آفتابِ نیم شبی : فکر و نظر " " : جولائی ۱۹۶۴ء

۵۳۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے : اُردو ادب " " : شمارہ (۳) ۱۹۶۹ء

۵۴۔ اُردو رسمِ خط فکر و نظر، علی گڑھ : شمارہ (۱) ۱۹۷۱ء

۵۵۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد : " " : شمارہ (۳) ۱۹۷۱ء

۵۶۔ عزیزانِ علیگڑھ (۱) " " : شمارہ (۲،۱) ۱۹۷۲ء

۵۷۔ عزیزانِ علیگڑھ (۲) : " " : شمارہ (۳) ۱۹۷۲ء

۵۸۔ عزیزانِ علیگڑھ (۳) : " " : شمارہ (۲،۱) ۱۹۷۳ء

۵۹۔ نیا شعر و ادب۔ مشمولہ "مداوا" از فرقت کاکوروی : لکھنؤ : ۱۹۴۴ء

۶۰۔ نیا ادب میری نظر میں مشمولہ "نیا ادب میری نظر میں" از آغا سرخوش
قزلباش : دہلی : ۱۹۴۴ء

۶۱۔ اُردو لٹریچر (انگریزی) مشمولہ "انڈین لٹریچر آف ٹوڈے" (انگریزی)
مرتبہ سجاد تن کاڈیا : بمبئی : ۱۹۴۷ء

۶۲۔ غالب اور علیگڑھ مشمولہ "احوالِ غالب" مرتبہ مختار الدین : علیگڑھ : ۱۹۵۳ء

۶۳۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ مشمولہ "نقدِ غالب" مرتبہ مختار الدین : علیگڑھ : ۱۹۵۶ء

۶۴۔ سرسید اور علی گڑھ مشمولہ "علیگڑھ تحریک، آغاز تا امروز"
مرتبہ نسیم قریشی : علیگڑھ : ۱۹۶۰ء

مقدمات، پیش لفظ وغیرہ

۶۵۔ سلسبیل آلِ احمد سرور دہلی : ۱۹۴۵ء

۶۶۔ باقیاتِ بجنوری عبدالرحمٰن بجنوری " : ۱۹۴۰ء

۶۷۔ باقیاتِ فانی (دیوان) شوکت علی خاں فانی بدایونی آگرہ

۶۸۔	آتشِ گل	دیوان	جگر مرادآبادی	لاہور[1]	
۶۹۔	ادب کا مطالعہ		اطہر پرویز	علی گڑھ	۱۹۶۳ء
۷۰۔	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ		قمر رئیس	″	۱۹۶۳ء
۷۱۔	نقشِ قدم		جمیلہ خاتون	لاہور	۱۹۶۶ء
۷۲۔	ڈاکٹر ذاکر حسین: سیرت و شخصیت		عبداللطیف اعظمی	نئی دلی	۱۹۷۰ء
۷۳۔	اُردو کا المیہ[2]		مسعود حسین خاں	علیگڑھ	۱۹۷۳ء

۱۔ لاہور کے ایڈیشن کا سال اشاعت معلوم نہیں ہو سکا۔ انجمن ترقی اُردو ہند، علیگڑھ نے اسے جولائی ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔

۲۔ اس کتاب کے شروع میں پیش لفظ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ دراصل یہ موصوف کے متعدد خطوط کے [illegible]ات پر مشتمل ہے، جو انھوں نے مصنف کو ان کے مضامین کے بارے میں لکھے تھے، جن کا مجموعہ اس کتاب میں ہے۔

افکار

رشید احمد صدیقی
کرشمہ اور کارنامہ

رشید صاحب اس دور کے عظیم ترین صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ اُردو نثر کی مزاج دانی اور آہنگ شناسی جس طرح ان کی تحریروں میں ملتی ہے اس کی نظیر اُردو ادب میں کمیاب ہے۔ وہ الفاظ کی نغمگی، معنویت، تصویر کشی اور خیالیاتی کیفیت کو اس انداز سے برتتے ہیں کہ بقول انیس "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"۔ رشید صاحب کے طرز تحریر نے اُردو نثر کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ اور اسے وسعت، پہنائی اور رنگینی کی نئی کیفیات بخشی ہیں۔ ان کے اس ست رنگے اسلوب کے کئی رنگ ہیں۔ اس کے بانکپن، نکیلے پن اور البیلے پن نے اُردو نثر کو نئی تہہ داری اور طرحداری بخشی ہے۔

رشید صاحب کے طرز تحریر کی تشکیل میں تین عناصر کی واضح طور پر نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ پہلا عنصر مریاہو ضلع جونپور کے اطراف و جوانب کی قصباتی زندگی اور تہذیب اور اسی کے ساتھ ساتھ ضلع کی عدالتوں کے اس ماحول کا اثر ہے جن سے رشید صاحب ابتدا میں وابستہ رہے۔ یہ قصباتی تہذیب وہ تھی، جو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کی پروردہ ہند ایرانی تمدن کی باقیات کی حیثیت سے نواح کے قصبوں میں بکھر گئی تھی۔ اس تہذیب میں رکھ رکھاؤ، ضبط و احتیاط، توازن، تمیز اور شائستگی موجود تھی اس پر مستزاد قانون کا ڈسپلن جو لفظوں کو ضبط و احتیاط سے برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ قانون، منطق اور ریاضی فکر کی

ژولیدگی کو دور کرکے استدلال کی صلابت اور راست خیالی پیدا کرتے ہیں۔ قانونی عدالتوں کی فضا لفظوں کے منطقی طمطراق کے گرد گھومتی ہوئی اور لفظی موشگافیوں کی پیدا کردہ وکیلوں، جھوٹے گواہوں، اہلمدوں اور پیشکاروں کی فضا ہے جس میں ہندستانی سماج کی ذہانت، چالاکی اور عظمت و عبرت کی داستان سموئی گئی ہے۔

دوسرا اہم عنصر ہے علیگڑھ کی اقامتی زندگی۔ علیگڑھ کالج کا تصور آج کی علیگڑھ یونیورسٹی کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ علیگڑھ کالج آکسفرڈ کے طور پر قائم کیا ہوا بنیادی طور پر اقامتی ادارہ تھا، جہاں ہندستان کے مختلف علاقوں کے اور بالخصوص اتر پردیش کے رؤسا کے گھرانوں کے نوجوان انگریزی اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم ہی نہیں تربیت پاتے تھے۔ لباس، کھانا پینا، ملنا جلنا، کھیل کود، اٹھنا بیٹھنا، شہسواری، تقریر و تحریر اور کرکٹ سبھی کے اصول و ضوابط یہاں سکھائے جاتے تھے۔ علیگڑھ آج بھی چھوٹا سا شہر ہے رشید صاحب کے زمانے میں قصبہ ہی تھا۔ یکّوں کا چلن تھا، اقامت گاہوں میں دھول اڑتی تھی۔ کچی بارکیں تھیں، لہٰذا تفریحی مشاغل میں گپ اور اقامتی زندگی کی شرارتوں کا درجہ سب سے بلند تھا اس کے بعد یونین کی ڈیبیٹ اور کرکٹ اور ٹینس کے لان کا اقامتی زندگی کی گپ جس میں ایک خاص شگفتہ لب و لہجہ، نجی انداز گفتگو، قصہ گوئی کی تصویر کشی قوت بیان اور خوش طبعی کا رنگ لازمی ہے۔ جہاں گفتگو سنجیدگی سے بوجھل ہوئی تو توجہ بھٹکنے لگی۔ اسی اقامتی زندگی کا ایک فیض یہ بھی تھا کہ رشید صاحب صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے جو اس زمانے کے علیگڑھ کالج والوں کے لیے مانوس اور متعارف تھے۔

تیسرا اہم عنصر انگریزی کے ان صاحب طرز انشا پردازوں کا اثر ہے جن تک رشید صاحب کی رسائی غالباً علیگڑھ کالج کے ذریعے ہوئی۔ ان سے رشید صاحب نے طہارت فکر اور لبرل ازم ہی نہیں سیکھا، بلکہ اظہار کے ایسے متعدد پیرایے بھی سیکھے، جو انگریزی نثر میں خاصے کا درجہ رکھتے تھے۔ مختصر ترین لفظوں میں بلیغ انداز سے کسی بات کو اس انداز سے ادا کر دینا کہ اس سے ایک جہانِ معنی نظر کے سامنے آجائے اور پھر ندرت ادا،

شگفتہ بیانی اور لطیف مزاح کے پہلو بھی ہاتھ سے نہ جانے پائیں، یا متضاد خیالات کو قولِ محال کی شکل میں ترتیب دے کر رنگین بیانی کا انداز پیدا کرنا یا طویل مرکب جملوں کی مدد سے پورا نقار خانہ سجانا، یہ سب ہنر ایسے ہیں جو مغرب سے اور بالخصوص انگریزی نثر نگاروں کے اثر سے ان تک پہنچے ہیں اور انھیں رشید صاحب نے اپنے مزاج کے نسخۂ کیمیا سے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ انھیں کی خاص ایجاد قرار پائے۔

(۱)

بقول نیاز فتحپوری رشید صاحب اُردو کے تنہا مزاح نگار ہیں، جو فکر انگریزی کو مزاح کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ جوکر اور مزاح نگار میں بنیادی فرق یہی ہے۔ جوکر مضحک صورتیں بنا کر لوگوں کو ہنسنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مزاح نگار لوگوں کو ان کی اپنی مضحک شکلیں دکھاتا ہے، گویا سماج کے سامنے آئینہ رکھ دیتا ہے اور سماج کی تمام ناہمواریوں کو بے نقاب کرکے انھیں ہنسنے ہنسانے ہی کا نہیں عبرت اور فکر کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ رشید صاحب کے مزاح کے موضوعات متنوع اور رنگا رنگ ہیں، لیکن ان کے اسلوب کی گہری ادبیت ان کا منفرد رنگ ہے) اسی لیے رشید صاحب کا مزاح پطرس کی طرح نہ زود ہضم ہے نہ ہلکا پھلکا۔ رشید صاحب کے مزاحیہ اسلوب میں کلاسیکی روایت کا رچاؤ اور رومانیت کی رنگینی اور ادب کی فکر خیزی، خیال انگیزی اور ہنر اور شیوہ گی موجود ہے۔

ادب رشید صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نقاد رشید احمد صدیقی نے غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ غزل کی جو بات انھیں سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ اس کی موجیت اور جامعیت ہے۔ رشید صاحب نے غزل کے اشعار کو جس قدر متنوع اور مختلف حالات پر منطبق کیا ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے غزل بھی تصوف کی اصطلاح میں بے ہمہ اور باہمہ کا درجہ رکھتی ہو، اور ہر موقع اور ہر محل کو بیان کرنے پر قادر ہو۔ دراصل رشید صاحب کے لیے ادب روایت نہیں زندگی ہے۔ ان کے نزدیک ادب صرف بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہی نہیں ہے، اظہار کا بہترین وسیلہ

اور خیر الکلام ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تجربوں کا عطر ہے اور جب وہ زندگی کے مختلف تجربوں سے گزرتے ہیں تو اگلوں کے ان تجربوں کے عطرِ مجموعہ کو ساتھ رکھتے ہیں، جو اجداد نے زندگی کی بوقلمونی سے حاصل کیا تھا۔

اردو کے نثری اسلوب پر علمِ فصاحت و بلاغت کے فاضلوں کے ہاتھوں بڑا ستم یہ ہوا کہ اوّل تو نثر کی خود مختاری ہی کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اس کے مقفّیٰ، مسجّع یا مرجز ہونے پر اس کی خوبی اور درجہ بندی قائم ہوئی یا دوسرے ان خصوصیات سے مبرا نثر کو عاری کہہ کر ہر طرح کے نثری اسالیب کو اسی تحت میں شامل کر لیا گیا (سچ پوچھیے تو سچی نثر ہمیشہ عاری ہی کے تحت آئیگی کیونکہ وہ قافیے یا سجع کے کھٹکے یا شعر کی ترصیع اور رعایت لفظی کی پابند ہوئی، تو وہ شاعری کی محتاج ہو کر رہ جائیگی اور اپنی خود مختاری حاصل ہی نہ کر سکیگی) بہت آگے بڑھے، تو علمائے فصاحت نے نثر پر بھی ایجاز و اطناب کی اصطلاحیں صرف کر ڈالیں جن میں سے اکثر بےمحل تھیں۔ یہ کہنا کہ کلام موقع و محل کے مناسب ہو، یا اس میں غیر ضروری تکرار یا پھیلاؤ نہ ہو، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی کو سمو دیا جائے، سامنے کی باتیں ہیں اور نثری اسلوب کی طرحداری کے مختلف انداز و اسالیب کے تجزیے سے ذہن کو ہٹاتی ہیں۔

غالباً رشید صاحب پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اردو کے بنیادی اسلوب کا مسئلہ اٹھایا ہے، اور اس کی حد بندی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشا کی طرح وہ اسے بھاکا پن اور عربیت، فارسیت کے درمیان سلاست کی کوئی منزل قرار نہیں دیتے۔ مگر اسے ایک ایسا اسلوب ضرور قرار دیتے ہیں، جو ایک طرف روزمرہ کی بول چال سے اپنے رشتہ استوار رکھے اور دوسری طرف ادبی روایت کے کلاسیکی مآخذوں سے گل بوٹے کھلاتا چلے۔ رشید صاحب کا اپنا اسلوب سادگی اور سلاست سے تو اتنا معمور نہیں، لیکن کلاسیکی انداز کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے والا انداز انھوں نے اس کامیابی سے برتا ہے کہ اسے سلیس بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ غالب کے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ایسا لگتا ہے کہ ان خطوط کا مصنّف کسی بازار کے چھجے پر بیٹھا ہے اور آنے جانے والوں سے بات چیت کرتا جاتا ہے، کسی کی خیریت

پوچھ لی، کسی سے دو گال ہنس بول لیے، کسی پر چھینٹا کسا، کسی سے غمگساری کی دو باتیں
کہیں، غرض خوش طبعی کی ایک ایسی فضا ہے جو خطوں کے ہر لفظ میں برقی رو کی طرح
دوڑتی نظر آتی ہے۔ یہی حال رشید صاحب کی نثر نگاری کا ہے۔ تنقید ہو یا طنز و
مزاح، سماجی اور سیاسی مسائل پر ان کے مضامین ہوں، یا ان کے مکاتیب، سب میں یہی
خوش دلی، دردمندی، خوش طبعی اور رکھ رکھاؤ جاری و ساری ہے۔

ہر صاحب اسلوب کے کچھ مخصوص پینترے اور کچھ محبوب پیرایے ہوتے ہیں۔ خیر، یہ رشید
صاحب کے بھی ہیں۔ لیکن ان میں ذات کا خلوص اور تجربے کی روشنی کچھ اس ڈھنگ
سے شامل ہے کہ یہ کرتب بازی نہیں رہتی، جگر کاوی بن جاتی ہے۔ رشید صاحب اکثر
پیراگرافوں میں سوچتے ہیں۔ ہر پیراگراف گویا ایک فکری وحدت ہو اور مختلف ٹکڑوں
سے بنائے ہوئے تدریجی کلائمکس کی تشکیل کی گئی ہو۔ عام طور پر ! کا نشان اسی کلائمکس
کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس عمل سے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اوّل تو اس پورے عمل کے پیچھے
پس منظر کا بڑا وسیع اور گہرا احساس جانے انجانے شامل رہتا ہے۔ رشید صاحب
کے ہاں محض ادبی ہی نہیں، تاریخی تسلسل کا احساس بہت شدید ہے، اسی لیے وہ کبھی بھی وقتی
ہیجانات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ مزاجاً مشرقی ہیں اور مشرق کے آئین و آداب انھیں
اس درجہ عزیز ہیں کہ اسے وہ اشرافیہ کا کلچر ہی نہیں جانتے بلکہ کلچروں کا اشرافیہ قرار
دیتے ہیں۔ یہاں مراد مشرق کی کئی جہات سے ہے جس میں روحانیت کا ایک خاص تصوّر،
مذہبی اقدار کا ایک خاص حد تک احترام، جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ، ضبط و نظم کا لحاظ،
اور مشرق کی اس تہذیب کی تصویر سے محبت بھی شامل ہے جس میں غرناطہ و بغداد کا
رنگ و آہنگ اور اسلام کے ماضی کے شاندار لمحوں کا گزرا ہوا جمال بھی رچا بسا ہوا
ہے۔ بایں ہمہ، رشید صاحب کے ہاں عصبیت اور تنگ نظری شاذ ہی ملے گی۔ انھیں
فرقہ پرست کہنا، یا کسی ایک طبقے (خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو وہ) پر دوسروں کو قربان کر
دینے والا ظلمت پسند کہنا ممکن نہیں کیونکہ ان کی نظر سے کبھی تاریخی اور تہذیبی سیاق و
سباق سے نہیں ہٹتی اور اسی لیے تاریخی شعور پر کبھی تعصب کو فوقیت دینا، ان کے

لیے محال ہے۔

وہ ذہنی طور پر لبرل ہیں، گو طبعاً ان کا میلان کنزرویٹو کی طرف ہے، مگر (ان اصطلاحوں سے یہاں برطانوی طرز فکر کے مختلف اسالیب مراد ہیں) وہ طبیعت کے اعتبار سے جیالہ روی کے قائل ہیں۔ ان کا نظام شمسی ایک مخصوص کشش پر قائم ہے اور جب تک مرکز ثقل کی یہ کشش قائم ہے وہ انتشار اور اختلال سے بھری دنیا میں اپنے جواہر نگار قلم سے اسی قدر دلسوزی اور دل آویزی کے ساتھ اقدار کے ایسے مراکز ثقل کی تلاش کرتے رہیں گے جو اس بکھراؤ اور بے ترتیب عناصر کو یکجا کر سکیں۔ ان کا اسلوب اسی تلاش کا ایک وسیلہ ہے۔

ایک بار گفتگو میں انھوں نے نثری اسلوب کو سمفنی سے تشبیہ دی ہے، جس میں مختلف نغموں کے درمیان ایک توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا لازمی ہو۔ پھر اس کی توجیہ کرتے ہوئے اقدار کے درمیان توازن پر زور دیا تھا۔

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ تمام کائنات جو ہمارے علم میں ہے یا علم کے باہر ہے جس میں ہم ملفوف یا سمفنی ہیں اپنی جملہ تفصیلات، جزئیات اور تضاد و توافق کے ساتھ ایک مکمل سمفنی یا سنگیت ہو، جس کا کوئی نغمہ غیر از آہنگ نہ ہو۔ کائنات کی یہی صفت یا قدرت اس کے تمام مشمولات کو خواہ وہ کتنے ہی عظیم یا حقیر، معلوم یا نہ معلوم کیوں نہ ہوں، ایک دوسرے میں پیوست اور ایک دوسرے سے مربوط، مزین، مستحکم اور بامقصد رکھتی ہے جیسا قانون کی زبان میں، تولے اور سنبھالے رکھتی ہے۔

اس حقیقت یا استعارے کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ اخلاق ہو یا آرٹ، مذہب ہو یا زندگی، ان کے جملہ شیون کے اظہار میں لازم آتا ہے کہ ہم مذکورہ کائناتی یا الہیاتی سمفنی کا پورے طور پر لحاظ رکھیں، جس سے وہ شہ پارہ ظہور میں آیا، یا لایا گیا۔ اس میں نظم و نثر کی قید نہیں۔ قید صرف اتنی اور اس کی ہے کہ نظم ہو یا نثر، عبارت، اشارات اور ادا کے اعتبار سے غیر از آہنگ یا بے سری

> نہ ہو یا بالفاظ دیگر اسلوب یا اظہار یا دونوں میں مناسب حال معنی کا ہونا ضروری ہے اس لیے ہر اظہار یا اسلوب کائناتی معنی کا جزو ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا، تو ہونا چاہیے! اخلاقِ فاضلہ ہوں یا فنونِ لطیفہ یا زندگی کے دوسرے اہم سالک معاملات، موزوں اسلوب و اظہار کے بغیر وہ ہمیشہ کم عیار قرار پائینگے ؟

فکر اور تہذیب کی یہی استقامت رشید صاحب کے اسلوب کی کلید ہے۔ بلاشبہ ان کے اسلوب کی بنیاد فکر پر ہے، محض جمالیاتی کیف، لفظی شعبدہ گری اور تفریح و مزاح پر نہیں وہ پڑھنے والے تک نئی بصیرت پہنچانا چاہتے اور اس کے لیے خطیبانہ یا ناصحانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے اپنے تجربے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنا جلیس بنا لیتے ہیں رموزِ حکمت کو نغمی راز و نیاز کے پیرایے میں ڈھال کر بیان کرتے ہیں اور کہیں کہیں ایسی سادہ مزاجی اور بے ساختگی سے کہ ان پر سعدی شیرازی کا گمان ہونے لگتا ہے جملۂ معترضہ انھیں بہت عزیز ہے اور ان کے اکثر جملہ ہائے معترضہ بلکہ بقول ان کے "صفحہ ہائے معترضہ" بھی اخلاقی اقدار کے تذکرے میں صرف ہوئے ہیں' اخلاقی اقدار کے نظام کو انھوں نے جہاز کے لنگر سے جابجا تشبیہ دی ہو کہ طوفان میں یہی لنگر جہاز کو بچانے کا وسیلہ بنتا ہے ان کا آرٹ استقامت کی تلاش ہے' اور یہ استقامت انھوں نے اپنے اسلوب میں مختلف اجزا کی مدد سے بہم پہنچائی۔

فکر اس استقامت کی اساس ہے لیکن فکر کو وہ کئی پردوں میں چھپا کر دلکش اور دل آویز ہی نہیں بڑا ہی مسکت اور قابلِ قبول بنا کر پیش کرتے ہیں اس کے لیے ان کے پاس سب سے بڑا حربہ ان کی اپنی شخصیت ہے۔ "ناکردہ گناہوں کی داد" غالب نے چاہی تھی۔ ان کی بیداد رشید صاحب ہنسی خوشی قبول کرتے ہیں۔ افراد و اقوام کی جن خرابیوں کو ہدف بنانا مقصود ہوگا انھیں خواہی نخواہی وہ یا تو اعترافِ جرم کرکے انھیں اپنا لینگے کہ تنقید ہو، تو خود ان کی ذات پر ہو' اور وہ ہنتیں تو پہلے اپنے آپ پر ہنسیں' تاکہ پڑھنے والے کو ناگواری نہ ہو اور اس کے جی کا ملال دھل جائے پھر بات جتنی سنجیدہ ہوگی وہ مزاح کا اتنا ہی سہارا لینگے، لیکن یہاں مزاح پیرایہ ہوتا ہے مقصود بالذّات نہیں یہ گویا نمک خوانِ تکلّم ہے جس کا مقصد لذّت و کیفیت

میں اضافہ ہے۔ قرنوں کا تجربہ اور روایتوں کی روح ایک آدھ بانکے ترچھے جملے میں جگمگا اٹھتی ہے (مثلاً اس قسم کے جملے: "شاعر خدا سے جتنا گستاخ اور موت سے جتنا محتاط ہوا اتنا ہی عظیم ہے") مزاح کی لگاوٹ سے وہ تہذیبی اور ثقافتی صداقتوں تک پہنچتے ہیں اور انھیں اپنی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھ نکالتے ہیں، جس میں ادب کی رنگینی کے اچھے خاکوں سے مناسب ذرہ بجز بہم پہنچ سکے۔ یہ فکر و احساس چونکہ پوری شخصیت کے رچاؤ بساؤ کا حصہ ہے، اس لیے پوری شخصیت کو دلسوزی، ندرت، ادا اور بانکپن کے ساتھ ابھرتا ہے۔

فکر و احساس کی صراحت کے واسطے رشید صاحب آزادی کے ساتھ واقعات اور کرداروں کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں کوئی پرانا قصہ ایک خاص ڈھنگ سے سناتے ہیں، کہیں کوئی قصہ تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثالیں پرانے دنگل میں استادوں کا اپنے شاگردوں کو لنگوٹ کے سچے ہونے کی قسم کھلوانے کا قصہ ہو یا پھر ان مفلوک الحال شریف زادے کا قصہ جو محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتے تھے، مگر کھانا کھاتے وقت ضرور کسی کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے تھے یا پھر کیچ والے کے گھر کا قصہ جو عبرت و عظمت کا مرقع ہے۔ فکر و احساس کے اسی پیرایے کو کبھی کبھی وہ کرداروں کی شکل دے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض کردار ان کے تخیل کی تخلیق ہیں، بعض مادّی زندگی میں موجود تو تھے یا ہیں، لیکن ان کی شخصیت اور کردار کو رشید صاحب کی نظر ہی نے ایک واضح رخ بخش دیا ہے۔ ان میں حاجی بلیغ العلیٰ جیسے کئی کردار شامل ہیں۔

کردار نگاری اور شخصیت فہمی کے سلسلے میں ایک ضمنی بحث رشید صاحب کے ان سوانحی اور تاثراتی خاکوں پر بھی واجب ہے، جو انھوں نے مختلف شخصیات پر لکھے۔ رشید صاحب بامروّت اور نستعلیق ہیں، اس لیے جس شخصیت کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں، اسے بے نقاب کرنا، یا اس کی کمزوریوں کا تذکرہ کرنا خلاف تہذیب جانتے ہیں اور مشرقی تہذیب کے پرانے آئین و آداب کے مطابق اپنے ہیرو کے مناقب پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے تخیل کی رسائی دور تک ہے اور وہ بالطبع فیّاض ہیں۔ لہٰذا اپنے ہیرو کی معمولی معمولی باتوں کو بھی خوبیوں کی طرح بیان کرتے ہیں اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کی بھی فیاضی اور درگزر سے پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ان کے ہیرو ایسے بھی ہیں، جن

وہ خود کبھی بہت قریب نہیں رہے۔ جذباتی اور ذہنی طور پر بھی نہیں مثلاً ابوالکلام آزاد یا جواہر لال نہرو۔ ایسے بھی ہیں، جن کے دامن میں ایسی کوئی چنگاری تھی جو شعلہ بن کر خراج وصول کر سکے، جیسے گھنٹہ بجانے والا چپراسی، مگر رشید صاحب نے ہلے بودہ رستان کو بھی "رستم جلواں" بنانے کے اصول پر عمل کر کے اپنے اندازِ بیان کے امرت سے ان شخصیات کو جگمگا دیا ہے، جن سے ہیرو کی شخصیت کی بے کم و کاست تصویر تو سامنے نہیں آتی البتہ خود رشید صاحب اور ان کا نظامِ اقدار بے نقاب ہوتے ہیں۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا۔ رشید صاحب کو غالب کے اشعار اور ان کے ممدوحین کے انتخاب نے۔ مگر وہ اس قیمت پر بھی اپنے ممدوحین کی کُلاہ اور زیادہ کج کرنے میں کمی روا نہیں رکھتے۔ ان ممدوحین کے انتخاب اور ان کے پیرایۂ ستائش پر غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے کہ رشید صاحب کو چند اعلیٰ اقدار کی تلاش ہے جنھیں وہ تہذیب و طمانیت کا جوہر جانتے ہیں۔ جہاں کہیں اور جس کسی میں وہ اقدار پاتے ہیں اسے اپنا لیتے ہیں، جس کسی کو پسند کرتے ہیں، اس میں ان اقدار کو ڈھونڈھ نکالتے ہیں، یا پیدا کر لیتے ہیں۔ ان اقدار میں گرمجوشی، خلوص، استقامت اور ذہانت اور وضعداری کو جیسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یونیورسٹی کا گھنٹہ بجانے والے چپراسی کی استقامت اور وضعداری انھیں پسند ہے۔ حسرت بھی انھیں خوبیوں کے باعث عزیز ہیں۔ اصغر اور جگر کے ہاں بھی وہ انھیں خوبیوں کو ڈھونڈھتے ہیں۔ گرمجوشی، ذہانت اور خلوص کی تلاش میں وہ ذاکر صاحب اور اقبال سہیل تک پہنچتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کو ادبی اور فنی نوک پلک بخشنے اور انھیں ایک ہیرو کی طرح ابھارنے میں رشید صاحب کی تحریروں کا بڑا حصّہ ہے۔ جن ذاکر صاحب سے ہندستان واقف ہے وہ صدر جمہوریۂ ہند تھے۔ مگر جن ذاکر صاحب سے ادبی دنیا واقف ہو وہ رشید صاحب کے 'مُرشد' تھے، جن کی ذہانت برقِ بے اماں تھی۔ جن کی محبت اور گرمجوشی متاعِ بے بہا اور جن کی سخن سنجی، حسنِ مزاج اور بزم آرائی دولتِ بیدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو ان تمام اعلیٰ اقدار کے امین کی طرح پیش کیا ہے جو مشرق میں تہذیب کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔

ان ممدوحین کی فہرست پر غور کرنے سے یہ بھی احساس ہوگا کہ رشید صاحب کو ہندایرانی

تہذیب عزیز ہے، جو اسلامی تہذیب کے غلط نام سے مشہور ہے۔ رشید صاحب کو اس تہذیب کے ہندستانی روپ ہی سے پیار نہیں ہے اس کا عجمی اور عرب روپ بھی عزیز ہے۔ اس کے حال زبوں سے ان کا جی دکھتا ہے اور اس کے ماضی کے عیوب کی پردہ پوشی کر کے اس کے کارناموں پر فخر کرنا انھیں پسند ہے تاکہ ماضی کی اقدار سے مستقبل کا تانا بانا تیار کیا جا سکے۔ انھیں وہ سب لوگ عزیز ہیں، جو اس تہذیب کے پروردہ یا اس کے معمار ہیں۔ جو اس تہذیبی روایت سے جتنا قریب ہے اور اس تہذیب کی قدروں کا جتنا زیادہ قائل اور جتنا زیادہ عامل ہے، رشید صاحب کی تعریف و تحسین کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہے۔ اسی لیے سرسید احمد خاں اور مولانا محمد علی اور ان کی فکری وراثت کے ادبی روپ اور اس کے رہبر و رہنما انھیں یکساں طور پر پیارے ہیں۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ یہ لگاؤ تعصب اور تنگ نظری کے سبب نہیں، بلکہ اس کی بنیاد یہ احساس ہے کہ جسے اسلامی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ عالمی تہذیب کا ایک اہم تاریخی جزو ہے اور انسان نے تہذیب و تمدن کی جو منازل طے کی ہیں، ان میں اس تہذیب نے بھی بہت کچھ دیا ہے اور عالمی تہذیب کے اس حصے کو فراموش کرنا، گویا عالمی کلچر کی نفی کرنا ہے۔ ہندستان میں بدقسمتی سے اسے "ہندو" تہذیب کے مقابل سمجھ لیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندستان میں عالمی تہذیب کے ایک وسیلے کی حیثیت سے آئی اور اس کی آفاقیت کو یہاں کی "مقامیت" میں گم کر دینا نامناسب ہوگا۔ ایک کا رشتہ ہندستان کی زمین سے ہے، دوسرے کا آفاقی کلچر کی کھلی ہواؤں سے۔ اسی تہذیب کے حال زبوں نے رشید صاحب کو مزاح نگار سے مصلح قوم بنا دیا۔ وہ سیاسی اور تہذیبی مضامین کی طرف راجع ہوئے۔ اس بات کو ایک بار انھوں نے نجی گفتگو میں عجیب انداز سے بیان کیا تھا۔ ذکر ان کے ایک مجوزہ مضمون کا تھا، جس میں گویا روز حساب، اور داور محشر کے سامنے جواب دہی کا بیان ہونا تھا۔ الزام یہ تھا کہ قدرت نے مزاح نگاری کی بہترین صلاحیتیں بخشی تھیں، انھیں پوری طرح بروئے کار لانے کے بجائے آخر تہذیبی اور مصلحانہ مضامین کی طرف توجہ کر کے ان صلاحیتوں کا خون کیوں کیا گیا؟ جوابِ عرض دعوے کا یہ تھا کہ جب بازی کے سبھی شاہ پتے۔ یکا، غلام، بیگم۔ بادشاہ کٹ جائیں تو جوکر ہی کو اپنا فرض نبھانا پڑتا ہے۔

اس چھوٹے سے قصے میں رشید صاحب کی پوری شخصیت جلوہ گر ہے۔ اوّل تو ان کی مذہبیت کی طرف اشارہ ہے اور محشر کے دربار اور صلاحیتوں کے خداداد ہونے کے بیان سے ملتا ہے، دوسرے پیشی اور مدافعت کا پورا انداز عدالتوں سے رشید صاحب کے شغف اور ان کے ماضی کا آئینہ دار ہے۔ پھر تاش کے کھیلوں کی اصطلاحات ان کی برج سے دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں، جو ٹینس کے بعد شاید ان کا محبوب ترین کھیل تھا۔ علاوہ بریں جس سیاق و سباق میں انھوں نے یہ بات کہی، اس سے ان کی دردمندی اور دلسوزی صاف جھلکتی ہے کہ انھیں ہندستان کی اور خاص کر ہندستانی مسلمانوں کی حالت زبوں اور نام نہاد رہنماؤں کی مصلحت پرستیوں کی نذر ہو جانے کا رنج کس قدر شدید ہے۔ اور اس رنج کو رشید صاحب کس قدر لطیف بلکہ مزاحیہ انداز میں ڈھالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں رشید صاحب کی سیاسی سمجھ بوجھ کے بارے میں کچھ لکھنا بے محل نہ ہوگا۔ رشید صاحب کو علیگڈھ بہت عزیز ہے اور وہ اسے مسلمانانِ ہند ہی نہیں مسلمانانِ عالم کی تہذیبی قدروں کا امین جانتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی ملک کی سیاست میں افتراق و انتشار پھیلتا دیکھتے ہیں، ان کا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر علیگڈھ میں انتشار و اختلال کو دور کرے اور یہاں کے دانشور ملک کے سامنے نیا لائحۂ عمل پیش کریں۔ وہ علیگڈھ کی اقامتی زندگی اور اس کے اقلیتی کردار دونوں کے قایل ہیں، یہی ان کے سیاسی میلان کی کلید ہے۔ مجلسِ مشاورت کا قیام بہت بعد میں عمل میں آیا؛ مگر مختلف نقاطِ خیال کے مسلمان اہلِ نظر کے درمیان مشاورت کی مدد سے ایک مشترکہ عملی پروگرام طے کرنے کا خیال جن لوگوں کے ذہن میں آیا تھا، ان میں رشید صاحب سرفہرست تھے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ رشید سیاست لبرل اور کنزرویٹو نقاطِ نظر کا امتزاج ہے اور اس پر علمی سیاست کی یا جذباتیت کے بجائے تحمل، اور میانہ روی کی مہر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سیاسی نقطۂ نظر خوش عقیدگی اور مثالیت کا آئینہ دار ہے۔ آج کی دنیا جمہوریت اور سوشلزم کی دنیا ہے۔ نصف سے زیادہ دنیا پر عوام کی حکمرانی ہے، جنھوں نے قدیم اشرافیہ، جاگیردارانہ شان و شکوہ اور سرمایہ دارانہ تہذیب کی چمک دمک کو ماند کر کے چاند پر کمندیں ڈالی ہیں، اور انسانی عزم و ارادے کی نئی سرحدیں متعین کی ہیں۔ رشید صاحب کا لبرل ازم نئی عوامی

قدروں کا قائل نہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے بالزاک بار بار یاد آتا ہے جو سماجی حقیقتوں کی عکاسی اور اپنے شفاف اسلوب سے دل موہ لیتا ہے، مگر اس کی ہمدردیاں انحطاط پذیر اشرافیہ کے ساتھ ہیں۔ رشید صاحب طرزِ فکر کے اعتبار سے انقلابی نہیں، اصلاح پسند ہیں۔ جو اصلاحات انھوں نے پیش کی ہیں، وہ محض خیالی نہیں۔ ان میں تجربے کی روشنی اور دلسوزی کی آنچ ہے۔ (مثال کے طور پر عزیزانِ علیگڈھ کے نام مطبوعہ 'قومی آواز' لکھنؤ کے آخری حصے کی تجاویز ملاحظہ ہوں)

جہاں کرداروں کی تراش خراش یا واقعات کے بیان سے کام نہیں چلتا، وہاں رشید صاحب تلمیحی اور تمثیلی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کے بعض تلمیحی تمثیلی ٹکڑے کلاسیک میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ شاید ہی اردو کے کسی نثر نگار نے تلمیح کا استعمال اس قدر زیادہ اور اس قدر خوبصورتی سے کیا ہو جتنا رشید صاحب کے مضامین میں ہوا ہے۔

تلمیح بھی رشید صاحب کا محبوب حربہ ہے۔ اعلیٰ کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے موسیقی بنیادی ڈسپلن ضروری ہے۔ اس کے بغیر تال سُر کی تمیز نہیں ہوتی، یہی حال رشید صاحب کے طرزِ تحریر کا ہے۔ کافی اور پکے گانے کی طرح، پہلے اس کے مزے سے مانوس ہونا اور کام طرزِ تحریر سے لطف لینے کے لیے پہلے روایت کے سرمایے اور کلاسیک کی دولت سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے کیونکہ رشید صاحب کا معمولی سے معمولی جملہ بھی سیاق و سباق کی کائنات ہمرکاب لاتا ہے۔ اور تلمیح کے جہان آباد کرتا چلتا ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں کسی شاعر نے کہا:

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت۔

وہی خانخانانی رنگ رشید صاحب کے طرزِ تحریر کا ہے کہ ان کا قلم بنجر زمینوں کو گلستان بناتا اور ریگستانوں میں خیابان و باغ آباد کرتا گزرتا ہے اور اس کام کے لیے تلمیح کے ذریعے تاریخ و تہذیب، ادب اور فنونِ لطیفہ کے ذخیروں سے خوشہ چینی کرتا رہتا ہے۔ اگر تلمیح پر نظر نہ ہو تو ان کی تحریر کا سیاق و سباق واضح نہ ہو پائیگا۔

رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین اور سنجیدہ تحریروں پر اکثر یہ اعتراض غلط فہمی کی بنا پر کیا جاتا رہا ہے کہ ان میں علیگڈھ بہت ہے۔ خود رشید صاحب نے یہ جرم بہت عام کر دیا ہے کہ علیگڈھ

جانے پہچانے بغیر ان کی شناخت ممکن نہیں۔ اس بھرم کا سبب رشید صاحب کی علیگڑھ سے بڑھی ہوئی محبت ہے اور محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب کے طرزِ تحریر کی پہچان کے لیے علیگڑھ اتنا لازمی نہیں جتنا ان تحریروں کا تہذیبی سیاق و سباق ہے۔ اور اس عظیم تہذیبی سیاق میں ایک صید زبوں علیگڑھ بھی ہے بقولِ غالب "مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجۂ خوں وہ بھی"، یعنی علیگڑھ محبوب نہیں، اس کا سمبل ہے۔

تمثیل سے بھی رشید صاحب نے بڑا کام لیا ہے۔ ان کے بہترین تمثیلی ٹکڑے ان کے مضامین "یکہ والا"، "سلام موچھ پر"، اور "دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے" میں نمایاں ہیں۔ (آخر الذکر دونوں "فکر و نظر" علیگڑھ میں چھپے)۔ ایک مضمون طلبا کی بدعنوانیوں اور تعلیمی دنیا کے خلفشار اور بدنظمی پر ہے جو خطاب طلبا ہی سے ہے۔ جا بجا پرانی تعلیم اور تربیت کی اعلیٰ قدروں کا تذکرہ ہے۔ ضبط و نظم، آئین بندی اور ضابطے کی پابندی کی برکتوں کا ذکر ہے اور طلبا کی نئی نسل کی بے راہ روی پر افسوس کا اظہار ہے۔ مضمون کا خاتمہ ذاتی، بلکہ نجی لہجے پر ہوتا ہے لکھتے ہیں:

> جب کبھی کانووکیشن سے واپس گھر جاتا تھا راستے میں نالے پر سے گزرتے ہوئے یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ نالے میں بہتا ہوا شفاف پانی اگر میرے باغیچے کو ملتا تو کیسے کیسے گلاب کھلتے۔ اس بار جب نالے پر سے گزرا، تو اس کے گندے اور کیچڑ بھرے پانی کو دیکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا کہ میرا باغیچہ اس گندے پانی سے محفوظ ہے۔

یہاں گلاب سے رشید صاحب کے غیر معمولی شغف کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ غیر معمولی شغف رشید صاحب کی شخصیت کا ایسا ہی لازمی جزو ہے، جیسے علیگڑھ، غالب، نیس، یا مرشد کیونکہ گلاب کے بغیر رشید صاحب کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ گلاب ان کے جیب و گریبان کی زینت نہیں، ان کی شخصیت، ان کے اسلوب اور ان کے ذوق میں گلاب کی یہ مہک سمائی ہوئی ہے۔ اس اقتباس میں کیسی تمثیلی تہہ داری مضمر ہے۔ آج کے نوجوانوں کی صلاحیتیں اگر تعمیری راہ

پا جائیں تو کیسے کیسے گلزار کھلا سکتی ہے۔

رشید صاحب کو ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کی ترتیب دینے اور ان سے نئی نئی تراکیب بنانے کا بھی شوق ہے۔ اس کا ذکر گلابوں میں قلم لگا کر نئی اقسام پیدا کرنے کے ضمن میں کیا جانا چاہیے۔ جونپور، لکھنؤ کے دبستان سے متاثر رہا ہے۔ صفی لکھنوی نے جونپور پر جو نظم لکھی ہے وہ اس تمدنی یگانگت کی ایک مثال ہے۔ لکھنؤ الفاظ کی مزاج دانی اور ان کی تہ داری اور ترکیبیں وضع کرنے میں بے مثال رہا ہے۔ رشید صاحب نے اس معاملے کو بازیگری، کرتب بازی، ثقالت اور بے تکی سے آزاد کرکے زندہ کیا اور دلچسپ بنا دیا۔ ان کی تراشی ہوئی متعدد ہم وزن الفاظ کی تراکیب اردو ادب میں عام ہوئیں اور ان کے نقش قدم پر چل کر متعدد انشا پردازوں نے اس قسم کے الفاظ کو یکجا کرکے نئی جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہم صورت الفاظ کی یکجائی سے خوشنمائی پیدا کرنا رشید صاحب کو قولِ محال اور ایجاز بیان کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ جس کی بنا پر بعض نقادوں نے ان کا رشتہ آسکر وائلڈ سے ملایا ہے۔ بعض نے سجاد انصاری سے بعض نے برنارڈ شا سے۔ یہ صحیح ہے کہ مزاجاً رشید صاحب دکشنری مین ہیں، ان کا قلعہ ان کا گھر ہے، ان کا پائیں باغ ان کی سلطنت، لفظوں کو ہیرے کی طرح تراشنا اور ان کو نت نئے مرکبات میں سجا کر ان سے برقی رَو پیدا کر لینا ان کا شغلہ ہے۔ مذہب اور اخلاق کا پاس، مروّت اور وضعداری سے لگاؤ، اور اس کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس کی اقدار کو ایک ضابطے اور نظام کا پابند پا کر گردشِ زمین سے ستاروں کا نغمہ سن لینے کی کاوش سبھی کچھ دکشنری مین ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا طرز لفظوں کا غلام نہیں، تہذیب اور معاشرت کو سنوارنے والے خیالات کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے الفاظ ماورائے سخن والی بات کو ادا کرتے ہیں محض بازیگری اور رعایتِ لفظی کا ذریعہ نہیں بنتے۔

لفظوں سے یہ شغف، ان سے آواز، رنگ، تصویر اور کردار نگاری کے کام نکالنا، دراصل رشید صاحب کی اس خوش مذاقی کی دلیل ہے، جو ان کے نزدیک زندگی کی

اصل روح ہے۔ وہ کرشمے ہوئے ذوقِ سلیم کے قائل ہیں، جہاں وہ زندگی کی اور لطافتوں کو عزیز رکھتے ہیں، وہیں حسنِ بیان کے بھی قدر دان ہیں، مزاح انھیں اس لیے عزیز ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی برکتوں کا ضامن ہے اور جہاں کہیں کوبڑ دیکھتے ہیں اسے ہنسی ہنسی میں ٹوک ضرور دیتے ہیں تاکہ ضمیرِ تہذیب مجروح نہ ہو یہ GENTLEMAN'S WIT محض خوش وقتی نہیں، اجتماعی ذمے داری کا نشان ہے۔ اندرے ژید نے کہا تھا کہ ہر حال میں خوش رہنا محض طبعی احتیاج ہی نہیں، اجتماعی ذمہ داری بھی ہے۔

اسی متوازن مذاقِ سلیم اور خوش ذوقی کی تلاش رشید صاحب نے اپنی تنقیدوں میں بھی کی ہے۔ ان کے اصولِ تنقید بھی اسی لطافتِ احساس کے آئینہ دار ہیں جس کے رشتے تصنیف اور الہام سے جا ملتے ہیں یہاں کا کوئی نام نہیں۔ اصول اور ضابطے کی حد بندیاں یہاں کام نہیں آتیں۔ اس قسم کے تنقیدی شعور کو نہ یونیورسٹیوں میں پڑھایا جا سکتا ہے، نہ سائنسی ضابطوں کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کا اظہار رشید صاحب کی تنقیدوں میں کوندتے اور دمکتے جملوں سے ہوتا ہے، یہ جملے ثبوت مہیا نہیں کرتے، مگر دور تک بصیرت کے افق روشن کرتے چلے جاتے ہیں، پڑھنے والا اپنے کو اجنبی ارتعاشات کی گرفت میں محسوس کرتا ہے اور اپنے پورے علمی اور ادبی شناسائیوں کی متاع کو لخت لخت مرتب کرنے لگتا ہے۔

مثلاً مغلوں نے ہندستان کو تین تحفے دیے: تاج محل، غزل اور مرزا غالب۔ یا غالب نے اردو غزل کو اپنا نسب نامہ دینے کی کوشش کی (یعنی اپنی وراثت کے ایرانی اثرات بخش دیے) نیا وجدان شعر بخشنے کے لیے کافی ہیں۔

رشید احمد صدیقی دراصل قامت آزادوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں فسانۂ آزاد بھی شامل ہے۔ محمد حسین آزاد کی باغ و بہار نثر بھی اور ابوالکلام آزاد کی پُر وقار اور دلآویز ادبی شخصیت بھی۔ مگر ان سب "آزادوں" سے بھی وہ آزاد رہے ہیں: دم بدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من۔ وہ اپنی انفرادیت کے بانکپن پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت اور اسلوب دونوں دورِ حاضر میں متاعِ رفتہ کا حسین ترین سراغ ہیں،

جسے غالب نے رہزن پر قرض سمجھ لیا تھا، متاعِ رفتہ جس میں صدیوں کی تہذیب کے زر و جواہر کی چمک جھلملا رہی ہے اور جس کے حسن اور دل آویزی سے اردو نثر نے نیا رنگ و آہنگ پایا ہے۔

وزیر آغا

رشید احمد صدیقی
ایک مفکر

اکثر لوگ رشید احمد صدیقی کا نام سنتے ہی مسکرانے یا قہقہہ لگانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہر اچھا مزاح نگار قاری میں REFLEX ACTION ضرور پیدا کرتا ہے، اور یوں وہ زمین از خود ہموار ہو جاتی ہے جس پر چند لمحوں کے بعد زعفران زار کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی! فائدہ یوں کہ مزاح نگار کو موزوں اور ہمدردانہ فضا کی تعمیر کے لیے کوئی خاص تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، جس کے نتیجے میں اس کی طنز کی لطیف سے لطیف جراحت اور مزاح کا موہوم خم بھی قاری کو مس کرتے ہوئے گزرتے لگتا ہے۔ نقصان یوں کہ قاری مزاح نگار کی اس صفت کے طلسم میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ اس کی نظریں ان بیشتر دوسری صفات کے لیے اندھی ہو کر رہ جاتی ہے جو ممکن ہے کہ اس مزاح نگار کا زیادہ قابلِ قدر سرمایہ تھیں۔ رشید احمد صدیقی کو اپنی مزاح نگاری سے فائدہ تو یقیناً پہنچا ہے کہ آج ان کا شمار اُردو کے بہترین طنز اور مزاح لکھنے والوں میں ہوتا ہے، لیکن نقصان کا اندازہ بھی لگائیے کہ اکثر لوگوں نے انھیں محض ہنسنے ہنسانے کا ایک ذریعہ سمجھا اور ان کی بیشتر دوسری صفات سے اس حد تک چشم پوشی اختیار کر لی، کہ ان کی مکمل ادبی شخصیت ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ کچھ لوگوں کو یہ تک نہیں معلوم کہ رشید احمد صدیقی کو طنز نگاری

کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی کمال حاصل ہے اور انھوں نے "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" میں اپنے چند معروف اور غیر معروف رفقاء کے ایسے خوبصورت خاکے لکھے ہیں کہ شاید اس میدان میں ابھی ایک لمبی مدت تک انھیں کسی حریف کا خدشہ نہیں ہوگا، مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ خاکہ نگاری کی اس صنف کو تو پھر بھی چند ناقدین نے سامنے لانے کی کوشش کی ہے (گو اس ضمن میں بھی رشید احمد صدیقی کی چھوڑی ہوئی "پھلجھڑیوں" ہی نے انھیں زیادہ متاثر کیا ہے) مگر ان خاکوں میں رشید احمد صدیقی خاکہ نگاری اور مزاح نگاری سے اوپر اٹھ کر جس خوبصورتی اور اعتماد کے ساتھ ایک مفکر کی حیثیت میں ہمارے سامنے آئے ہیں، اس کا بھرپور تذکرہ ابھی تک ہم نے نہیں کیا؛ اور یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔

یاد رہے کہ میں نے رشید احمد صدیقی کو مفکر کہا ہے، مصلح نہیں! مصلح کے ہاں بھی فکر کا عنصر ہی غالب حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ عنصر زیادہ تر مستعار ہوتا ہے، جب کہ مفکر اسے اپنے تجربات سے کشید کرتا ہے۔ دوسرے، مصلح چاہتا ہے کہ اپنے ملری جواہر کو اس طرح سے بروئے کار لائے کہ قارئین اس کی دکھائی ہوئی راہ پر بڑھتے چلے جائیں، جب کہ مفکر کے ہاں ایسا کوئی مقصد نہیں ہوتا؛ اس کے ہاں افکار کے اظہار کا اس کی اپنی ذات کے انکشاف کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ان دونوں میں ایک اور فرق بھی ہے مصلح جب بھی خطاب کرے گا، ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑے ہو کر، جس کے نتیجے میں اس کی آواز تصنع کی حد تک بلند بانگ ہو جاتی ہے۔ مگر مفکر کے ہاں خود کلامی کا انداز ملتا ہے، جو ایک معتدل لہجے کو جنم دیتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں مصلحین تو انگنت دستیاب ہوتے رہے ہیں، جب کہ مفکر کبھی کبھار ہی پیدا ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی بھی مفکر ہیں، مصلح نہیں! جب وہ کسی شخصیت پر سے پرتیں اتارنے لگتے ہیں، تو اس عمل کے دوران میں قطعاً غیر ارادی طور پر اپنی ذات پر سے بھی ایک آدھ پرت اتار دیتے ہیں، اور قاری فکر کی تازگی اور تجربے کی صداقت کی ایک ہلکی سی جھلک ہی سے دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے زندگی کو کسی مکان کی چھت پر سے نہیں دیکھا،

بلکہ انھوں نے اسے نیچے بازار میں اُتر کر "محسوس" کیا ہے۔ احساس کی یہ سطح صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب گزرتا ہوا ہجوم آپ سے ٹکرا کر گزر جائے؛ اور آپ خوشبو کو بدبو، سختی کو نرمی، اور حرکت کو ٹھہراؤ سے تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں۔ رشید احمد صدیقی نے نصف صدی تک زمانے کو "محسوس" کیا ہے اور زندگی کے لاتعداد کرداروں کو ان کے ہر رنگ روپ میں دیکھا ہے۔ نتیجۃً ان کے ہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ، تجربے کی صداقت اور تازگی بھی اُبھری ہے۔ مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے اپنے افکار کو قارئین پر لادنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باتوں باتوں میں غیر رسمی طور پر ان کا اظہار کیا ہے۔ اسی لیے ان کا تاثر بھی شدید ہے۔

رشید احمد صدیقی کے ہاں فکر کی گہرائی، اسلوب کی تازگی اور تجربے کی صداقت کا اندازہ ان چند جملوں سے لگائیے، جو میں نے اُن کی تازہ کتاب "ہم نفسانِ رفتہ" سے لیے ہیں:

> سچی وطن دوستی اور سچی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں۔ انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ ہے، اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے۔

> جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں، وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی حاصل کر لیتی ہیں، لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کیے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں، وہ بڑی مدت میں "بعد از خرابیِ بسیار"، ان سے نجات پاتی ہیں۔

> انسان کی سیرت اور شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے، کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمّع قائم نہیں رہ جاتا۔

> زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے، جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع اور انقلاب سے محروم ہوتی ہے؛ اختراع اور انقلاب صرف افراد کا حصّہ ہے۔

جب تک کوئی متعلّم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے ۔

مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں دور اور کم ہی یاد اللہ رکھتا ہوں ۔ ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساسِ کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگزر اور دردمندی اور اسی طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب اور اخلاق کی روح ہیں، اکثر لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں ۔

سید صاحب (سید سلیمان ندوی) کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابلِ احترام تھی ۔ اُن کو دیکھ کر اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی، کہ وہ شفقت کرینگے، رسوا نہ کرینگے، اور جب تک ساتھ رہینگے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی

کھیل میں، کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے ۔

علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی، طلبا کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی ۔ اب تک طالبعلم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا ۔ اگر ایک عالِم کی موت عالَم کی موت ہے، تو ایک عالِم کی بے حرمتی کو کیا کہینگے !

مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز سمجھتا ہے، جیسے اس میں برہمنیت راہ پا گئی ہو، اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو ۔ لیکن وہ اپنی معمولی سی بات سے بےخبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے، تو اس کا مامور ہونا اس کی آزمائش پہلے ہے، اور فضیلت بعد میں ۔

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچّوں سے کتنی محبت ہے ۔

آخر کار منصب نہیں، بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے ۔

دنیوی جاہ و حشمت سے بے نیاز تھے، کسی سے جھگڑتے نہیں تھے، جھگڑنا اپنے رُتبے سے فروتر سمجھتے تھے، لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اُترتے تھے۔ حریف کے مقابلے میں یہ ان کی پہلی جیت ہوتی تھی

ان چند اقتباسات کے مطالعہ سے رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے بہت سے پہلو نظر کے سامنے اُبھر آتے ہیں جن سے ایک نئی تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کشادہ نظری کے ساتھ ساتھ کشادہ دلی کی بھی فراوانی ہے۔ وہ مذہبی "تنگ نظری اور "برہمنیت" کے مخالف اور عام زندگی میں چشم پوشی اور درگزر کے قائل ہیں۔ ایک اسکالر کی شان بھی یہی ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں خیر سے ایسے ایسے "اسکالر" بھی موجود ہیں، جو اپنی شکست کا انتقام لینے یا محض حسد یا احساسِ کمتری کے تحت شخصی سطح پر اُتر کر پست ترین اندازِ تخاطب اختیار کرتے ہیں بھی کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے۔ پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کے لغت میں کشادہ نظری گالی کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں، کہ وہ "تنگ نظر دانشمندوں" کی صف میں شامل ہیں۔ ادبی پستی اور بازاری سطح کی اس فضا میں جب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی عالی ظرفی کی مثال سامنے آتی ہے، تو زندہ رہنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ جو لوگ موصوف کے مزاحیہ مضامین کو اس غرض سے پڑھتے رہے ہیں کہ مکروہاتِ دنیا سے چند لمحوں کے لیے فرار حاصل کر سکیں، ان سے میری گزارش ہے کہ وہ اب ان کے ان مضامین کا بھی مطالعہ کریں جو ہمیں زندہ رہنے اور زندگی کو اس کی تمام تر صعوبتوں اور ناخوشیوں کے ساتھ قبول کرنے پر مائل کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے یہ مضامین قاری کو زندگی کی پست سطح سے اوپر اُٹھاتے اور اسے زندگی کرنے کا گُر سمجھاتے ہیں۔ ان میں فکر کے عناصر ایک ایسی دلآویز شخصیت کو بےنقاب کرتے ہیں، جو تعصّب، جنگ، گھٹن اور تنگ نظری کے اندھیروں میں روشنی کے ایک مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش کہ ہم لوگ روشنی کے اس مینار سے نور کا اکتساب کر سکتے!

رشید احمد صدیقی
بحیثیت مزاح نگار

اُردو ادب میں طنز و ظرافت کا نام لیجیے، تو وزن و وقار، گہرائی اور معنویت، نفاست اور پُرکاری کے اعتبار سے سب سے پہلے ہماری نظر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرف جاتی ہے۔ بہرحال اپنے فن اور مواد کے بل بوتے پر اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور سب سے زیادہ دیر تک زندہ رہنے والے طنز نگار ہیں۔ دور سے دیکھیے تو ان پر فلسفی اور مرثیہ گو کے معجون مرکب کا گمان گزرتا ہے، گفتگو سنیے، یا ان کی تحریر پڑھیے، تو زعفران زار، فرحت و انبساط سے بھری ہوئی، خندۂ زیر لب کو دعوت دینے والی، قول محال کا اعلیٰ نمونہ، ذہن کے گوشوں کو بیدار کرنے والی۔

مزاح زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہر کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور طنز کی ہلکی ہلکی آمیزش اُسے جاندار، تابناک اور دیرپا بنا دیتی ہے۔ زندگی کی کجروی، افراد کی کمزوریاں، ان کے تناقص اور ان کی بوالعجبیاں، اسی صورت میں نظر آتی اور مزاح کے لیے خام مواد فراہم کرتی ہیں، جب ایک طرف مزاح نگار کے تجربے میں وسعت، تنوع اور رنگا رنگی ہو، اور دوسری جانب اسے اظہار و ابلاغ کے ذرائع پر پوری دسترس۔ مزاح کے نقوش ہلکے اور گہرے ہوتے ہیں، اس کی اقسام بھی مختلف ہیں اور ان میں طنز کی چاشنی اُسی وقت پیدا کی جاسکتی ہے، جب نظر حجابات سے گزر کر حقیقت کے جلوہ کی تاب

لاسکے۔ مزاح نگار کا مزاج، ہجو نگار کے مزاج سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں جوش و جذبہ کی کمی، عام سوجھ بوجھ اور لاتعلقی کی فراوانی ہوتی ہے۔ حسِ ہنسی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ مزاح نگار میں تندی، تیزی اور جھلاہٹ نہیں ہوتی، بلکہ سطحِ آب کا سا سکون اور نرم روی۔ وہ نہ انقلاب کا پجاری ہوتا ہے، نہ بلند آہنگ اصول کی میزان پر عمل اور اخلاق کی بے راہ روی کو تولتا ہے، نہ اپنے اعلا نصب العین کے طلسم کے ٹوٹ جانے پر اپنی روح کی واماندگی اور تلخی کو آفاقیت کا رنگ دینے پر آمادہ۔ وہ تو بس اپنے ذہنی مینارے میں اطمینان سے بیٹھ کر انگشت، رواں دواں مخلوق پر نظر ڈالتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسان کی بے تکی اور غیر آہنگ باتیں، ان کے اقوال و افعال کا تضاد، ان کے احوال و رجحانات کا تناقض، ان کی دماغی غیر حاضری، ان کی غیر ارادی حرکات، اُن کا غیر سماجی پن، ان کے خیالی ردِ عمل کی سست رفتاری، ان کے اندر لچک اور مطابقت کی کمی، ان کی شخصیتوں میں حقیقت اور فریب کا تنافر، ان سب کو وہ خود دیکھتا، دوسروں کو دکھاتا اور اپنے تاثرات کو قہقہے میں ڈبو دینا چاہتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اس کو ہنسنے پر مجبور کرتا ہے، سماجی یا اخلاقی انقلاب کے لیے نہیں اُبھارتا۔ ہنسی چونکہ ایک سماجی عمل ہے، ایک آواز ہے، جو بازگشت کی طالب ہوتی ہے، اس لیے ہم بھی اس ہنسی میں خوشی خوشی شریک ہو جاتے ہیں۔ برگساں کی رائے کے مطابق مزاح نگار وحدت کی بجائے کثرت کے ماحول کو پسند کرتا اور اس میں اپنے فن کو پروان چڑھاتا ہے۔ وہ براہِ راست ترغیب نہیں دیتا، محض لطیف اشارے کرتا ہے۔ اس کا تعمیر کی بہ نسبت تنقید کی جانب زیادہ میلان ہوتا ہے۔ اس کا احساسِ برتری صرف فریبِ نظر ہے، کیونکہ وہ اپنی کوتاہیوں اور غیر آہنگ برتاؤ اور عمل پر بھی خوب کھلے دل سے ہنستا ہے۔ وہ بزرگوں کے اس عقیدے کو سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ ہنسی سلیم الطبع انسان کی صحت کی ضامن ہے۔ غیظ و غضب، اور کینہ پروری سے وہ اپنے آئینۂ دل کو ملوث نہیں ہونے دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہمدردی، رحم اور محبت پر بھی عارضی طور سے پہرے بٹھا دیتا ہے، کیونکہ یہ دونوں قسم کے ہنسی کے شفاف، رواں اور ابلتے ہوئے چشمے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے اور اسے گدلا کر دیتے ہیں۔[1]

اس کی ہیل ہمیشہ خالص ذہانت سے ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کا فن اور ان کی شخصیت ان تمام لوازمات کو پورا کرتی ہیں، جن کا ذکر ابھی کیا گیا۔ ان کے تجربات میں وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے تمام وسائل پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور انھوں نے ان کو عملاً استعمال بھی کیا ہے۔ اگر ان کے مضامین اور تقریروں کے مجموعہ پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے مزاح کی کارفرمائی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ وہ مختلف النوع افراد، جماعتوں اور پیشوں کے حالات سے صحیح واقفیت رکھتے ہیں، اور ان کی بوالعجبیوں کو اپنے مزاح اور تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولوی، پروفیسر، لیڈر، شاعر، وکیل، گواہ، عاشق، روشن خیال بیوی، آئی، سی، ایس افسر، نان کوآپریٹر، اراکین پارلیمنٹ، فلسفی، چور، فنکار وغیرہ ان کے خاص کردار ہیں، جن کے قول و عمل کے تضاد و تنافر اور مضحکہ خیز پہلوؤں کو توڑ مروڑ کر مبالغہ آمیزی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں، اس لیے کہ مبالغہ اور توڑ مروڑ، مزاح اور تضحیک کے عناصر ترکیبی میں شامل ہیں۔ علاوہ ان خامیوں کے، جن کا ذکر ہوا، مزاحیہ کردار میں دو خصوصیات کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ اوّل، ایک نوع کا بے لوچ پن اور سخت گیری؛ اور دوسرے خود بینی اور خود نمائی۔ یہ دونوں خصوصیات اس امر کی علامت ہیں کہ ایسا کردار نہ اپنے آپ میں ربط تلاش کر سکتا ہے، اور نہ سماج کے دوسرے افراد سے تطابق اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ فریب میں مبتلا رہتا ہے، اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی چیز مزاح نگار کو ہنسنے پر اکساتی ہے اور چونکہ مزاح کو طنز سے الگ رکھنا دشوار ہے، اس لیے بعض مستثنیٰ صورتوں کے علاوہ ہنسی کبھی خالص اور بے میل نہیں ہوتی۔ مگر رشید صاحب کے طنز میں زہر آلود تلخی، مردم بیزاری اور حقارت نہیں ملتی، بلکہ بہت ہلکے اور معقول سے چھینٹے۔ یہ کہنا بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہے کہ نہ صرف سنجیدہ اور اہم خامیاں اور کوتاہیاں ہی، بلکہ بعض اوقات غیر اہم خامیاں بھی، مزاح نگار کے طنز کا ہدف بن جاتی ہیں، اور ایسی حرکات بھی جن میں خلوص کے ساتھ غلو برتا گیا ہو۔ یہ اس لیے کہ مزاح نگار خوش مذاقی اور ضبط کا دلدادہ ہوتا

ہے، اور ضرورت سے زیادہ جوش و خروش کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے؛ وہ اس پر مسکرا دیتا ہے۔ لیکن یہ امر ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ مزاح نگار کا مقصد ضرر رسانی، یا دل آزاری نہیں ہوتا؛ اس کا مطمحِ نظر اصلاحی اور افادی بھی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے تفننِ طبع اور طنز کے تیروں کا نشانہ بننے کے بعد ہمارے اندر احساسِ نفس جاگ اٹھے، جو پایانِ کار ہماری اصلاح کا موجب بن جائے۔ لیکن یہ مزاح نگار کا مقصدِ اولین نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ ہمارے بے ہنگم افعال اور خود بینی و خود نمائی کے مظاہر کا تماشہ خود دیکھے، اور دوسروں کو دکھائے؛ اور ان سے انبساط حاصل کرنے کا سامان فراہم کرے۔

اس امر کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اشیا اور خاص طور پر افراد کے غیر متناسب پہلوؤں کے مشاہدات اور ان پر غور و فکر کے نتیجے کے طور پر مزاح وجود میں آتا ہے۔ لیکن مزاح کی مختلف اقسام ہیں۔ یہ تقسیم ان اثرات کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے، جو اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ مزاح خالص نقالی بھی ہو سکتا ہے، علمی اور جذباتی بھی، اور طنزیاتی بھی۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں ہم بے تحاشا ہنسنے بلکہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن سے کہیں زیادہ ہمارے پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے؛ اس میں لطافت اور بذلہ سنجی کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب وہ عملی مذاق ہے، جس کے ذریعے سے ابتدائی زمانے کا انسان اپنی ظرافت کو ظاہر کیا کرتا تھا۔ اس میں تناسب اور اعتدال بھی بار نہیں پاتے۔ علمی مزاح خالص ذہانت کو اپیل کرتا ہے۔ عمل کی طرح خیال میں بھی بوالعجبیاں ہو سکتی ہیں؛ انھیں ظاہر کرنے کے لیے مزاح نگار لفظوں کے الٹ پھیر کے فن سے کام لیتا ہے۔ علمی مزاح قہقہہ کے بجائے صرف تبسم زیرِ لبی کی دعوت دیتا ہے، اور ذہن میں ایسی خوشگواری کے ساتھ نفوذ کرتا ہے، جیسے بنفشی شعاعیں جسم کے مساموں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جذباتی مزاح بظاہر ایسا مرکب معلوم ہوتا ہے، جس کے عناصر ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ [illegible]۔ اس سے مراد، مزاح کی وہ قسم ہے جو جذبات کو اپیل کرنے والے حالات کا تمسخر اڑاتا ہے۔ ہمدردی، محبت، رقابت اور خلوص کے مظاہرے بھی بعض اوقات ہمیں

ہنسنے کی دعوت دیتا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ جذبات بجائے خود قابلِ تضحیک ہوتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ کبھی کبھی ان جذبات کا مظاہرہ کرنے والے حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جانے کی وجہ سے مضحک نظر آتے ہیں، اور بعض اوقات ان کے یہاں حقیقت اور اس کے خیالی پیکر میں بغایت تفاوت ہوتا ہے۔ مزاح کی چوتھی اور آخری قسم وہ ہے، جہاں تفنّنِ طبع کے پیچھے اور اس میں ملی ہوئی تھوڑی سی جلن (WIT) بھی ہوتی ہے، اور یہ ہر اس مزاح نگار کے یہاں مل جائے گی، جو لطف و انبساط کا شائق ہونے کے ساتھ ہی تھوڑا سا شعور اور آگہی بھی رکھتا ہو، جس کے مزاج میں ہمواری، توازن اور عقلِ سلیم کے ساتھ ہی تفکر، احساس اور کسی قدر حقیقت پسندی بھی ہو؛ ایسے شخص کی ہنسی سادہ اور بے میل نہیں ہو سکتی۔

مزاح کی تقسیم ایک اور اصول پر بھی کی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات مزاح صرف الفاظ کے ذریعے سے پیدا کیا جاتا ہے، یعنی الفاظ کی ترتیب کچھ اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس وہ مزاح ہے، جو خیالات کے تضاد اور ان کی غیر ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے۔ پھر مزاح کے لیے قولِ محال کا استعمال بھی حد درجہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اس میں بھی عکسِ ترکیب کا وہی طریقہ بروئے کار لایا جاتا ہے، جو الفاظ کے سلسلے میں مفید ہوتا ہے۔ مزاح اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے، جب مزاح نگار کسی خاص صورتِ حال کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ بعض دفعہ محض نامتناسب اشیا یا خصوصیات کو بالمقابل رکھنے سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ مقبول ترین مزاح اقدار کے نرالے لامرکزی اور غیر متناسب پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے ابھرتا ہے۔ ہم ان پر کچھ تو اس لیے ہنستے ہیں کہ یہ پہلو حقیقت کی عام تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سماج کے مطالبات سے غیر آہنگ ہوتے ہیں؛ اور کچھ اس لیے کہ ہم اپنے تئیں کم از کم عارضی طور پر، یعنی ان کرداروں سے لطف اندوز ہونے کے دوران میں، انھیں کمزوریوں اور غلطیوں سے منزّہ اور بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ غالباً اسی بنا پر سترھویں صدی کے مشہور سیاسی مفکر "ہابس" نے یہ

خیال ظاہر کیا تھا کہ مزاح عارضی احساسِ تفاخر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا خیال حکیم افلاطون کے یہاں بھی ملتا ہے۔ مزید برآں مزاحیہ فضا کی تشکیل سے بھی ہمارے احساسِ مزاح کی تسکین ہوتی ہے۔ اور ہم تھوڑی دیر کے لیے زندگی کے غموں، اور اس کی گرانباریوں اور محرومیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن مکمل ترین مزاح اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کہ خیال، کردار، صورتِ حال اور فضا چاروں ایسی ہوں کہ وہ ہمیں بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیں، اور ہم ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے زندگی کے طربیہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

رشید صاحب مزاحیہ تاثرات کی تشکیل کے لیے مختلف وسائل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی سرحرفی صنعت (ALLITARATION) کے بہت دلدادہ ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں اس صنعت کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ بذاتِ خود یہ صنعت مزاح کا موجب نہیں بن سکتی، لیکن جب اسے مخصوص سیاق و سباق میں استعمال کیا جائے، تو نتیجہ حسبِ دلخواہ برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً ان جملوں کو پڑھیے، جن میں کہیں مزاح کا مدار سرحرفی صنعت سے کام لینے پر ہے اور کہیں ایک ہی لفظ کو مختلف مفہوم میں استعمال کرنے پر۔ بہرحال الفاظ کی صوتی حیثیت غور طلب ہے:

"میرے نزدیک بارہ اڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا، گھونگھٹ، گندگی اور گھٹنا۔"

"ہر مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونی چاہیے۔ بصورتِ دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گزر جائے۔"

"تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا سمجھانا نہ بیہودہ ہے، نہ بیانو ہے"

"ایک دن میز، منجو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔"

"ایک دکان کی بالائی منزل پر ریڈیو سے تانیں اڑ رہا تھا۔ نیچے مجمع تھا۔ بچہ ماں تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے، بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں،

فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچّے گولی کھیلتے تھے، بوڑھے قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی۔

"قوم کو خطرہ میں پاتے ہیں، تو چندہ وصول کر کے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس لیے کہ روپیا پیسا خطرہ کی چیز ہے، جس کے پاس ہوگی، وہ خطرہ میں ہوگا۔"

"بہرحال ہم لوگ آگے بڑھے، اور بہزار خرابی دوسری زندگی کے کنارے پہنچے، سورج ڈوب چکا تھا، اور ہم ڈوبنے کی فکر میں تھے۔"

مزاح کی ایک قسم وہ بھی ہے، جو سادہ اور بے میل ہنسی کی محرک ہوتی ہے، جس میں صنعت کاری کو دخل ہوتا ہے۔ نہ ارادہ اور تفکر کو، اور جس کی کوئی فنی فلسفیانہ توضیح بھی نہیں کی جا سکتی، بجز اس کے کہ وہ کسی کی خلاف معمول حرکت یا برتاؤ کی طرف اشارہ کرے۔ ایسی ہنسی کی جھنکار کے بھی مدارج ہیں۔ ایسی ہنسی بھونڈی اور غیر شائستہ بھی ہو سکتی ہے، اور لطیف اور ستھری بھی۔ اس کا انحصار خود اس امر پر ہے کہ مزاح نگار کا طبعی رجحان کس طرف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کو بگڑتے دیکھ کر، کسی شخص کی ہیئت کذائی کا مشاہدہ کرنے یا بعض اوقات ایسے افعال کے سرزد ہو جانے سے جو ہماری توقع اور ہمارے معمول کی شکست کریں، ہمیں بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی ہنسی میں بھی اعتدال، ضبط اور خوش مذاقی کو برقرار رکھنا اچھے مزاح نگار ہی کا کام ہے۔ رشید صاحب کے یہاں اس کے بعض نمونے دیکھیے:

"ان میں سے بعض ایسے فربہ تھے کہ خیال آیا کہ شاید ایک نہیں، دو ہوں۔ اس لیے ایک طرف مڑ کر دیکھنے لگا کہ کہیں ان کے پیچھے بھی تو دو ہاتھ اور دو منہ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی چیز ہندستان میں کسی زمانے میں پائی جاتی تھی۔"

پوچھنے لگے:

حضرت، آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟ میں نے کہا، جناب لکھنؤ سے آ رہا ہوں۔

فرمایا: وہاں مزارات ہیں؟ میں نے کہا جہاں کہیں مسلمان ہیں، وہاں مزارات ہیں۔ متولی اور سجادہ نشین کون ہیں؟ میں نے کہا: فی الحال تو میں ہی ہوں، اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے کے لیے ہندوستان آیا ہوں۔"

"ہمارے محلے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے، گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہے۔"

"بالآخر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ (ڈاکٹر خان) کوئی کہتا ہے، ملیریا ہے، کوئی کہتا ہے، ٹائیفائیڈ ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں، اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا مزاج ہے؟ تو اس قدر آہستہ جواب دیا۔ گویا الموڑہ سے آواز آرہی ہے: بخار ہے۔"

"مرشد نے فرمایا (ڈاکٹر ذاکر حسین): میری رائے تو یہ ہے کہ یورپ چلا جائے۔ راؤنڈ ٹیبل میں شرکت بھی ہو جائیگی، اور میموں سے جھجک بھی نکل جائیگی۔ میں نے کہا: مرشد، میموں سے جھجک کے کیا معنی؟ فرمایا یہی تھوڑی بہت یاد اللہ۔"

"میر صاحب چاہتے ہیں کہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے، اور نہ شکار کو اپنے پاؤں سے چلنے کی توفیق ہو۔ آرزو یہ ہوتی ہے کہ شکار کے بنگلے پر چلے جائیں۔ اگر مل جائے، تو فبہا، ورنہ کارڈ چھوڑ آئیں، اور شکار کی اخلاقی پابندی یہ ہے کہ وہ بازدید کے لیے میر صاحب کے آستانے پر حاضر ہو۔"

"بات صرف اتنی تھی کہ سب کے روپے میر منجھو کے پاس تھے اور میر منجھو سب گھر بھول آئے تھے۔ لیکن خود میر منجھو سے اس کی تحقیقات کی گئی، تو معلوم ہوا کہ روپے ان کے تھے اور بقیتوں کے دھلے۔ غلطی سے دھلے ساتھ

چلے آئے تھے اور روپے گھر دے گئے تھے۔"

"میں نے خطوط کی طرف رُخ کیا، معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں ہیں، اور بچے مکان پر ہیں، اور بچوں کے نانا نہایت پریشان۔ بیوی کو لکھا کہ میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا، اور نہ یہاں اس نیت سے آیا ہوں۔ بچوں کو لکھا کہ تم لوگ امّاں بی کو پریشان نہ کرو گے، تو پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیے جاؤ گے۔ ان کے نانا میاں کو لکھا: مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔"

"میرے غسلخانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی۔ دوسرے کی جگہ خالی تھی۔ اس پر مولانا (اقبال سہیل) بلاتکلف اس طور پر بیٹھ گئے، گویا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ یہ البتہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا، جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی۔"

"ابھی میں ان (بیرا) سے پورے طور پر ڈرنے بھی نہ پایا تھا کہ جھجک کر انھیں سلام کیا اور گلا صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا: مجھے ایک سرٹیفکٹ چاہیے۔ انھوں نے غالباً اس قسم کے تماشے اکثر دیکھے تھے، اس لیے بغیر کسی جھجک کے فرمایا: "ٹکٹ لاؤ۔" میں نے کہا، میں تو پیدل آیا ہوں۔ جھنجھلا کر بولے کارڈ۔ میں نے کہا، آج تو اتوار ہے۔ اس پر وہ مسکرا پڑے اور کہا بیٹھ جاؤ۔"

"مجسٹریٹ صاحب بھاری بھر کم آدمی تھے، اور بیگموں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے وزن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔"

بعض اوقات غیر متناسب اشیا کو پہلو بہ پہلو رکھنے سے بھی مزاح پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بے ربط الفاظ، اشیا یا خصوصیات عام طور سے تجربے میں بیک وقت نہیں آتیں، یا کم از کم ہم ایسی اُمید نہیں کرتے، لہٰذا جب مزاح نگار انھیں ہم رشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو ہم اس غیر متوقع واقعے سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اکثر ہم یہ بھی محسوس کرنے لگتے ہیں

کہ ان کی بے ربط اور غیر آہنگ خصوصیات کی موجودگی ہی ایسے کردار کو مضحکہ خیز بنانے کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ طریقۂ عمل ہماری ناپسندیدگی یا حقارت کو برانگیختہ نہیں کرتا، بلکہ ہم اس کے مشاہدے میں لطف اور خوشگواری پاتے ہیں، اور اس سے ہمارے احساسِ برتری و تفوّق کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

"معلوم نہیں مرحوم اس وقت علیین میں ہیں یا امریکہ میں، خاندان کو کبھی گرمی پکانے اور کیمیا بنانے کا خبط تھا ...... نمونیہ سے ڈرتے تھے اور ایک لڑکی پر عاشق تھے"۔

"آپ کا شمار نہ تو ائمۂ معصومین میں سے ہو، نہ حکومتِ برطانیہ سے کہ آپ سے غلطی کا ارتکاب ممکن نہ ہو"۔

"میں نے کہا: خوب، جنّت نیا شد، یہ دنیا ہے، جہاں مولوی اور پروفیسر اور تعزیرات ہند، اور ملیریا اور بیوی بچوں سے پالا پڑے گا۔

"آپ کسی چیز، شخص یا موقع کا تصوّر نہیں کر سکتے، جو پاسبانی سے خالی ہو؛ ایک بار یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا: "چیزیں ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ میں نے کہا: کیوں نہیں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا: کیسے؟ میں نے کہا: اور منطق کسے کہتے ہیں؟"

"اتنا ہی بیان دے کر حاجی صاحب نے داڑھی کو اس طور پر تکان دی کہ ایک ایک بال باہم اور بے ہم ہو گیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہو گئیں تو کرۂ سر کے خطِ استوا پر جا کر ختم ہوئیں۔ اور آنکھیں شاہنامۂ فردوسی بن گئیں"۔

"ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لیے موزوں ہے، مہاتما گاندھی یا ادہر کا کھیت۔ مہاتما گاندھی تو شاید اختتام پر ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ادہر کے کھیت کا انتظار ہے"۔

"ہندستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے، اکثر شفاخانہ میں، ورنہ جیلخانے میں؛ جیلخانے کا راستہ تو اکثر ادھر کے کھیت سے گزرتا ہے، اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے، جن پر سے موٹر بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی"۔

"کتنے ہیں جو ہندستان کے امن و ترقی کے لیے سلطنت برطانیہ ہی کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ حال آں کہ حکومتِ برطانیہ کے پاس دفعہ ۱۴۴ سے لے کر سرمائیکل اوڈوائر تک موجود ہیں!"

"میر جھکو نہایت تندرست تھے، لیکن شکل سے ہندستانی دوا خانہ۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے، اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے۔"

طنز کی صنعت مزاح کی صنعت سے وابستہ اور مربوط ہے۔ مزاح کا افادی پہلو براہ راست اسی وقت کارگر ہوتا ہے، جب کہ ہم ہنسی کی شادابی اور برجستگی میں تھوڑی سی کڑواہٹ اور ترشی بھی محسوس کریں۔ ہر وہ مزاح نگار جو محض تفنن طبع کا قائل نہیں ہے، بلکہ جس کے شعور و ادراک میں ذکاوت اور زود حسی بھی ہے، اپنے مزاح کو طنز کے چھینٹوں سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ رشید احمد صدیقی کی طنزیہ مسکراہٹ کی تان ہمیشہ تمدن کے شیون پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ چونکہ ان کا مزاح جن اجزا سے مرکب ہے، وہ عام مزاح نگار کی رسائی سے دور ہوتے ہیں، اس لیے یہ چھینٹے اوسط درجے کے پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈالتے۔ لیکن تربیت یافتہ قاری فوراً یہ محسوس کر لیتا ہے کہ مزاح نگار کے طنز کے تازیانے کی چوٹ کہاں پڑ رہی ہے، اور کسی خاص مقام پر اس نے اپنے مشاہدے میں ایسا پیچ و خم پیدا کر دیا ہے، جس سے اس کی ہنسی صرف ہنسی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ ایک نوع کی بالواسطہ اور ہوشیار تنقید بن گئی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں یہ نتیجہ اس لیے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ وہ محض واقعات سے مزاح نہیں پیدا کرتے، بلکہ ان کی نظر خاصی گہری اور دور تک جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اپنی اس خوبی کو اپنی بعد کی تحریروں میں قائم نہیں رکھ سکے۔ لیکن

بہرحال "مضامین رشید" میں بے شمار جملے ایسے ملتے ہیں، جو مصنّف کی بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور جنھیں پڑھ کر ہم بیک وقت ہنسنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اس امر کے اعتراف پر بھی، کہ رشید صاحب نے مزاحیہ انداز میں تمدّنی حالات پر چبھتی ہوئی تنقید کر دی ہے۔ ان تنقیدی اشاروں کی سچائی اور ان کا مؤثر ہونا ہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ خصوصیت اکبر اور رشید صاحب کے یہاں مشترک ہے:

"میرے سفر کی محرّک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں، آپریشن کرانا، یا سفر خرچ وصول کرنا، جس کے مجموعے کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے۔"

"یہی حالت بنگالیوں کی ہے۔ سفر میں ان کا محبوب ترین اور تنہا مشغلہ کھانا اور بکنا ہے۔ دنیا کی خرافات ترین اور کم سے کم داموں والی چیزیں کثیر ترین مقدار میں خریدینگے اور کھائینگے۔ دو چار پیسے سے زیادہ کی چیز نہیں خریدینگے اور بیچنے والے سے حجّت کرینگے، گویا ہندوستان کی حکومت خود اختیاری پر نمایندگان برطانیہ سے ردّ و کد کر رہے ہیں۔"

"عشّاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انگریزوں کو آئی۔ سی۔ ایس نے خراب کیا اور عشّاق کو شعرا نے۔"

"یہ کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک، اور ہندوستانی سردی کھاتے ہیں۔"

"(ڈاکٹر ذاکر حسین) کے آنے سے پہلے لوگ کچھ سراسیمہ سے ہو رہے تھے کہ اتنے میں کمرے کا کواڑ کھلا اور آپ اس طور سے ڈرتے جھجکتے داخل ہوئے، اور آتے ہی سارے مجمع پر چھا گئے۔ جیسے کبھی انگریزوں کی آمد ہندوستان میں ہوتی ہوگی۔"

"یکّہ چلتا رہا (مع تمام سامان اور اشخاص ضروریہ و غیر ضروریہ کے)، ایسا ہی جیسا کہ مسلمانوں کی انجمنیں یا تعلیم گاہیں چلتی ہیں، یا جس طور پر عشّاق کا بیان ہے، کہ اکثر ان کے گلے پر خنجر پھرا کرتا ہے۔"

"دلیر بنایا نہ بننا، قطعاً ذوقی چیز ہے؛ اور میرے لیے ہر ذوقی چیز قابلِ درگزر

ہے خواہ وہ عمرِ طبعی پر پہنچ کر شادی کرنا ہو یا ایلیڈ وی سے روٹی کمانا۔"

"عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ یا آڑ میں سب کچھ ہوا، جیلخانہ، ہسپتال، فنون لطیفہ، مضمون نویسی، ڈراما، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اس کی منت کش ہیں۔"

"یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے، جہاں عورتوں اور بچوں کو ممبروں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے، جتنا ہندستانی پارلیمنٹ میں ارکین پارلیمنٹ کو۔"

"کسی منچلے شہری کا اوہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے، جتنا کسی پبلک مشاعرے میں منچلے شاعر کا کلام سنانا۔"

"گواہ جھوٹا ہو، یا سچا، عدالت کے لیے اس کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے، جتنا برطانوی اقتدار کے لیے آئی، سی، ایس کا وجود۔ جس طرح عدالت کی کمزوری گواہ ہے، اس طرح برطانیہ کی کمزوری آئی، سی، ایس۔"

"ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے، جو کنگارو کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طرح کنگارو کا بچہ خطرہ کی آہٹ پا کر ماں کی جھولی میں بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے میں نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے۔"

"میں نے کہا، آپ کے یہ خیالات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں ہوں، اس لیے کہ چندہ دیتا ہوں، خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں، ہاں میں قرض کرتا ہوں۔"

"میر منجو ان لوگوں میں سے تھے، جن کی شادی والدین کرتے ہیں، اور عقدِ ثانی دوست احباب۔ کسی زمانے میں ان کی شادی ضرور ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کا

مخصوص برزخ اس پر گرا دہ تھا۔"

"لیکن مولوی بڑا سو دیشی ہے۔ اس کا تہمد بوسیدہ ہو جاتا ہے، تو اس کی دھجیاں مریدوں میں تبرکاً تقسیم کر دی جاتی ہیں ..... لیکن آئی، سی، ایس، از کار رفتہ ہو کر مراجعت وطن کرتا ہے، تو اس کے اخراجات موت و حیات بھی ہندستانیوں کے سر پڑتے ہیں۔"

"گھریلو بیوی، ہندستانی بیوی ہے، جس کو فریقین کے والدین بیاہتے ہیں، فریقین نباہتے ہیں اور ملک و ملت اسراہتے ہیں، دوسری طرف تعلیم یافتہ روشن خیال بیوی ہے جس کو فریقین کے احباب بیاہتے ہیں، احباب ہی نباہتے ہیں اور سوسائٹی سراہتی ہے۔"

"آج کل اخبار نویس کو بعض حواسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً آنکھ اس کے لیے بالکل زائد ہے۔ اس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔ گو ایسی حالت میں اکثر ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ ایڈیٹری شروع کرتے وقت کانوں کا جو سائز تھا، وہ ایڈیٹری ختم کرتے وقت بہت بڑھ جاتا ہے۔"

"صاحب عام طور پر ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو صبح آنکھ کھلتے ہی بغیر کلّی کیے چائے پی لیتے ہیں، اور دوسروں کی بیوی کا اپنے باپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جتنا بڑا صاحب ہوگا، اتنا ہی اس کا بیت الخلا اس کی چارپائی کے قریب تر اور بھائی بند دور تر ہوں گے۔"

رشید صاحب کا مزاح نگاری کا فن کرداروں کے پیش کرنے میں بڑی آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ ان کے نئے نئے نمونے پیش کرتے ہیں، جو جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے مخصوص افراد کی کمزوریوں کا خاکہ اڑایا ہو۔ ان کے نگار خانے میں ہمیں بعض تصویریں بڑی دلچسپ نظر آتی ہیں۔ ایسے مطالعے بہت قریب کے مشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا تمسخر جس انداز میں اڑایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہ ہمارے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مزاحیہ نگار ایسے مرقعے بڑے

کرنے میں قدرے بیرحمی برتتا ہے۔ اس لیے کہ تخلیقی عمل کے دوران میں وہ ہمدردی اور جانبداری کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے، تو مزاح پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر یہ دو خاکے دیکھیے:

"یہاں سے بابو رفیع اللہ خاں صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کو دیکھ کر خیال آیا کہ کوئی محدث دہلوی ہیں، یا پنشنر تحصیلدار۔ آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چھ انگل کا فاصلہ، پیشانی پر اتنی ہی جھریاں۔ اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پان کی پیک منہ میں تولتے ہوئے گرج کر بولے، جیسے معلوم ہوتا تھا کہ عراق عرب میں افواجِ برطانیہ کے ساتھ عرصے تک رہ چکے ہیں۔
تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ امرتیاں لائے ہو؟"

"جیب میں شیشیاں، بغل میں اوتل، ہاتھ میں آلاتِ جراحی، پیٹ میں درد، سر میں سودا، اور زبان پر اشعار، ڈاکٹر خنداں مرض بھی ہیں، اور مریض بھی"۔

ڈاکٹر خنداں اور حاجی بلغ العلیٰ، دو ایسے مزاحیہ کردار ہیں جن کا نقش ذہن پر دیر تک قائم رہتا ہے۔ لیکن رشید صاحب کے یہاں بیشتر کردار ایسے ہیں، جن کا کوئی نام نہیں ہے، بلکہ مختلف پیشوں اور گروہوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے تین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں یعنی مولوی، لیڈر اور وکیل۔ المیہ اور طربیہ کے کرداروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ المیہ کردار اپنی ذاتی اور انفرادی خامیوں اور خوبیوں سے اپنے آپ کو اس درجہ ہم آہنگ کر لیتے ہیں کہ ہم ان خامیوں اور خوبیوں کا مطالعہ کرداروں کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ طربیہ کے کردار نہ صرف سماج سے پوری طرح مربوط نہیں ہوتے، بلکہ اپنی خامیوں کو بھی اپنی شخصیت سے گہرا اِلحاق نہیں قائم کرنے دیتے۔ اسی سطحیت اور عدم تطابق کی وجہ سے ہم ان خامیوں کا مطالعہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ کرداروں کی شخصیتیں تہ در تہ ہوتی ہیں۔ اور طربیہ کے کرداروں میں شخصیت کا رچاؤ، اس کی گہرائی اور اس کے نشیب و فراز نہیں ہوتے۔ رشید صاحب نے وکیلوں اور مولویوں اور لیڈروں کی جتنی تصویریں کھینچی ہے، ان میں ایک طرف تو خاصی سفاکی اور شقاوت نظر آتی ہے، اور

دوسری جانب وہ ہمارے ذہن کو کسی مخصوص وکیل یا مولوی یا لیڈر کی سمت منتقل نہیں کرتیں، بلکہ وہ پوری جماعت کا ایک واضح تخیل پیدا کر دیتی ہیں۔ "گھاگھ" کی اصطلاح بھی بڑی ہمہ گیر اور کارآمد ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق مختلف النوع خامیاں رکھنے والے مختلف جماعتوں کے نمائندوں پر کیا جا سکتا ہے۔ "گھاگھ" اور "گھاگھس" کا فرق بھی گو بظاہر یہاں مہمل سا معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل ایک نازک فرق ہے، اور تجربے کے مدارج کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس طریقۂ کار سے مزاح نگار کی تنقید اور اس کے نقطۂ نظر میں ایک طرح کی عمومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے انگشت مخلوق کے ہجومِ بیکراں میں اپنی نظروں کو بعض لوگوں پر جما دیا ہے اور ان کی فنکارانہ تنقید کر کے عام انسانوں کی خامیوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ ان خامیوں میں بے لچکی، لالچ، خودبینی اور ذہنی غیر حاضری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور یہ تمام کوتاہیاں ایسی ہیں، جو فرد اور سماج کے درمیان عدمِ مصالحت یا عدمِ توازن و تطابق کو ظاہر کرتی ہیں۔ مزاح نگار کی تخلیق کا مقصد اصلاح یا انقلاب چاہے نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی طنز و ظرافت کے نشتر ہمارے خود اطمینانی اور خود فراموشی کے خول میں سوراخ کر دیتے ہیں، اور ہم چوکنا ہو کر اپنا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے لیے ایسے مرقعوں کی دلکشی صرف عارضی انبساط اور تفنن میں نہیں ہوتی، بلکہ وہ انسانی فطرت کے مختلف مظاہر میں اس کی بصیرت میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایک وکیل صاحب کا حلیہ ملاحظہ کیجیے، جو پوری ایک جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

> سر پر پٹے، جو نیچے سے علاحدہ کر دیے گئے تھے، ریشِ مبارک لمبی اور رسولی، سر اور ڈاڑھی کے بال خضاب کے مجرب ترین نسخوں سے سیاہ، چہرہ پر جھریاں، آنکھوں میں سُرمہ کی تحریر جلی۔ ململ کی ایک بند دار چکن زیبِ تن جو شاید کبھی تہ نہیں کی گئی، کیونکہ شکن کی وجہ سے تمام اچکن گھونگھریالے بال کی طرح حرہ دیتی تھی۔ سر پر ایک سفید عمامہ، گویا ابھی کہیں عقد پڑھا کر

چھوارے لیے چلے آرہے ہیں۔ غرارےدار پائجامہ جس میں چار انگل گوٹ لگی ہوئی تھی، اور جس کے حاشیے کے اندر سرخ ڈورے دیے گئے تھے، جو دھوبی کی مرحمت اور مرورِ ایام سے کپڑے کے اوپر نمایاں ہو چلی تھی۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا جس میں عرضی دعویٰ وغیرہ لکھنے کے مجرب نسخے تہ کیے ہوئے تھے۔

اب ذرا لیڈروں اور مولویوں کا حال بھی سنیے:

سیاسی گھاگھ، کرسیِ صدارت پر سب سے زیادہ بااطمینان کر بیٹھتا ہے، اور تحریر و تقریر میں صرف پولیس اور حکومت کے نمایندوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اگر گولیاں چلنے والی ہوں، یا طوق و رسن کی باری آئی، تو پھر وہ اپنے ڈرائنگ روم یا قلعہ کو کو اتنا محفوظ سمجھتا ہے، جتنا مسٹر لائیڈ جارج برطانوی اقتدار کو اور اب آئی سی ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں۔ اس کے نزدیک قوم کی حیثیت ایک نفس کی ہے، موقع ہو تو اس پر ایک مزار تعمیر کر کے نذرانے اور چڑھاوے وصول کیے جا سکتے ہیں۔

مذہبی گھاگھ کو مذہب سے وہی نسبت ہو، جو آج کے نوجوانوں کو اپنے والدین سے ہوتی ہو... ایک موقع پر تو وہ مذہب کا نام لے کر ہجرت پر آمادہ ہو جائیگا اور دوسروں کو ہجرت کرا بھی دیگا، لیکن دوسری جگہ وہ اسی مذہب کی آڑ پکڑ کر دارالحرب میں سود بھی لینے لگیگا اور شاید کسی بدنصیب مہاجر کی بیوی سے دوسرا نکاح بھی کر لے"

"لیکن مولوی کو دیکھیے: قول و فعل میں کسی سے پیچھے نہ رہا، ایک طرف وعظ کرتا رہا اور فتویٰ تکفیر دیتا رہا؛ دوسری طرف دعوت روا نہ کی اور تعدادِ ازدواج میں کمی نہ کی؛ تارکِ حوالات رہا، تارکِ لذات نہ ہوا۔ مولوی صاحب نازل ہوتے ہیں، "صائم النہار" و "قائم اللیل" کسی کو اولادِ نرینہ عطا ہوتی ہے کسی کو بہشت نصیب ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو جہنم کے ... مزد کیا جاتا ہے بعضوں کی جایداد کے متولی بنتے ہیں، تعویذ لکھتے ہیں، تو صرف مرغِ سفید کے خون سے، تاکہ دسترخوان پر مرغِ مسلم موجود ہو، عورتوں کو با جماعت تہجد ادا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

رشید صاحب کی ظرافت عام طور پر دو زندہ اور خیال انگیز ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات وہ اپنی

مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور سے اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہو جاتا ہو، بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ غالباً وہ اس ماٹ کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکے ہیں۔ یہ بات مثال سے صاف ہو جائیگی

نان کوآپریٹر کو انھوں نے ایک اشارے کی حیثیت سے جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور اس سے مقصد ایک خاص جماعت کی بوالعجبیوں کو اپنی طنز و ظرافت کا نقشہ بنانا ہے۔ حال آں کہ ان تمام مضامین کو پڑھ لینے کے بعد جہاں یہ ذکر آیا ہے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو رشید صاحب اس جماعت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں اور اس کے طریقۂ کار کی خامیوں کا احاطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں، یا یہ اشارہ ان کے مفہوم کی پوری طرح وضاحت نہیں کرتا۔ مزاحیہ نگار سے ہم کسی اخلاقی حقیقت پسندی کا مطالبہ نہیں کرتے، لیکن کم از کم اس مفہوم کی وضاحت کے ضرور خواہاں ہوتے ہیں جس کے ابلاغ کے لیے اس نے بعض اشارے یا کنایے وضع کیے ہیں۔ صوتی اعتبار سے بھی اس لفظ میں کوئی ایسی جدت نہیں ہے، جو مزاحیہ اثرات کی تشکیل میں ممد ہو۔ اس کے برعکس روشن خیال بیوی، آئی۔ سی۔ ایس، اور حاجی بلغ العلیٰ ایسے اشارے ہیں، جن سے کام لے کر رشید صاحب نے اجتماعی اور انفرادی حادثات اور حماقتوں پر اہم تنقیدیں کی ہیں، اور غالباً وہ ان اشاروں کو برتنے میں نان کوآپریٹر کی نسبت زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

اس سے کہیں زیادہ مسئلہ آرٹ کا ہے۔ رشید صاحب نے جگہ جگہ آرٹ کا ذکر تمسخر کے انداز میں کیا ہے اور ہر جگہ یہ کوشش مصنف کا مزاجاتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ آرٹ کے کسی خاص اسکول کو ناپسند کرتے ہوں، آرٹ کی بعض اقدار سے متفق نہ ہوں، نیز مخصوص آرٹ کو اخلاق کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہوں، اور ایسا کرنے پر اسے تسکین بخش اور اجتماعی مفاد کے مطابق نہ پائیں۔ مگر انسانی فکر و عمل کی آزادی، انسانی تخیل کی تگ و تاز، انسانی اقدار کے ارتقا، [illegible] کی لامحدود طاقت اور اس کے اظہار کو مضحک سمجھ کر اس کے [illegible] بلا تفریق اس مفہوم میں استعمال کرنا ذرا غیر منطقی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مصنف کے [illegible]

تقلیدی اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے۔ میں بخوفِ طوالت اقتباس پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ لیکن "گھاگھ" کے آخری ٹکڑے کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جہاں رشید صاحب نے آرٹ کو آزادیِ کار، آزادیِ افکار، آزادیِ نسواں کا مرادف قرار دے کر اسے قابلِ تضحیک قرار دیا ہے۔ یہ طرزِ عمل خود مضحکہ خیز ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشید صاحب اپنی بھلی بُری دنیا میں بند رہنا چاہتے ہیں، انھیں نئے خیالات اور نئی تحریکات سے نہ کوئی دلچسپی ہے، نہ ہمدردی، اور نہ انصاف سے وہ ان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ پیشرو اور ذہنی اور روحانی مرشد اکبر کو خضرِ راہ بناتے ہیں، جنھوں نے اپنے مزاحیہ اور طنزیہ کلام میں مغربی تہذیب اور تمدن کے کارناموں پر نہایت سطحی تنقید کی ہے۔

مضمون نگاری کے فن میں رشید صاحب نے ایک نئی صنف کا اضافہ کیا ہے۔ یہ صنف اپنی جگہ بالکل اچھوتی اور منفرد ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں حد سے زیادہ الجھاؤ اور انتشار پایا جاتا ہے، اور قاری کو عجیب عجیب طرح کی بھول بھلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بادی النظر میں یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ تاثراتی مضمون کو منطقی حدود میں مقید کر دینا جائز نہیں ہے۔ ایسے مضمون میں مصنف پہلے سے کسی بنی بنائی اسکیم کے مطابق آغاز اور انجام کی فکر نہیں کرتا، بلکہ اس کے وجدان کی لہر بہ خود مضمون کا تانا بانا اور رنگ روغن تیار کرتی اور اسے ایک عضوی وحدت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ کسی اچھے ادیب کے تاثرات محض ایک بے معنی طومار کی صورت میں نہیں رہتے، بلکہ اس کی سطحی بے ربطی کے نیچے معنی و مفہوم اور وابستگی کی تہ چھپی ہوتی ہے۔ ہاں کسی کو یہ بات مان لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ رشید صاحب بعض اوقات مضمون کے مزاحیہ ماحول میں فلسفے اور الہیات کی لمبی لمبی بحثیں شروع کر دیتے ہیں، جن سے قاری ہرگز لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ "گندم جنتی پر آدم و حوا سے باز پُرس کی گئی۔ گھاگھس کی گھگھی بندھ گئی۔ اپنے ظلم و خطا کا اس طور پر اعتراف کیا کہ گویا آپ کو ظلم و خطا پر قدرت تھی اور آپ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ گھاگھ سے دریافت کیا گیا، بولے: "مجھے آخر کس نے گمراہ کیا؟" یہ سوال آدابِ حرم سے بھی زیادہ پیچیدہ اور شاید اندیشہ ناک تھا۔ حکم دیا گیا، گھاگھ اور گھاگھس دونوں جلا وطن کیے جائیں، ایک

قسم کی بحثیں اکثر جگہ فکر کو ابھارنے پر ختم ہوتی ہیں، اور کہیں کہیں محض دھاندلی بازی پر۔ "مضامینِ رشید" کے سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پر مقامی رنگ اس حد تک غالب ہے کہ علیگڈھ والے ہی ان سے اچھی طرح لطف اٹھا سکتے ہیں، اور اس سے مزاح نگاری کی اپیل کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔ یہ اعتراض کچھ زیادہ قابلِ التفات نہیں ہے، اس لیے کہ رشید صاحب کے مضامین کی تحسین کے لیے پڑھا لکھا اور خوش مذاق ہونا زیادہ ضروری ہے۔ کہیں کہیں ایسے واقعات کا ذکر ضرور ہے، جو صرف علیگڈھ کی اقامتی زندگی کے پس منظر ہی میں قابلِ تفہیم ہو سکتے ہیں۔ مگر مضامین کے اہم حصّے جہاں اعلیٰ طنز و مزاح کے فن کی کارفرمائی ہے، علیگڈھ سے عدم واقفیت کے باوجود بھی ہم سے خراجِ تحسین حاصل کر لیتے ہیں۔ مضامینِ رشید کی فضا پر علیگڈھ کی زندگی کا پرتو کوئی ایسا سقم نہیں ہے، جس سے ان کی اہمیت پر معتدبہ اثر پڑے۔ اکثر فنی کارناموں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں اس ماحول اور فضا کی بازآفرینی کی ضرورت پیش آتی ہے جس میں ان کی تخلیق ہوئی ہو۔ آیندہ نسلیں اگر ان مضامین سے لطف اندوز ہونا چاہیں گی، تو انھیں ان حالات کی بازآفرینی کرنا پڑے گی، جو ان مضامین کا مرکز و محور ہیں۔

رشید صاحب اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں میں غالب اور اکبر کے علاوہ سب سے برتر ہیں۔ ان کی برتری کے دو سبب ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے مزاح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے تعلیم، شعر و ادب، قومی تحریکات، سائنس کے کمالات، سیاست اور حکومت، مغربی تہذیب، قومی اداروں اور افراد کی کمزوریوں، سب پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مزاح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خیال انگیز ہنسی کی تحریک کرتا ہے۔ ان کے مزاح میں تفکر ہے۔ ان کا مشاہدہ تیز، بیباک اور وسیع ہے۔ وہ بے جوڑ اشیا میں رشتہ دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور انہی امتیازات کو نمایاں کرنے پر ان کے مزاحیہ اثرات کا دارومدار ہے۔ رشید صاحب کی ہنسی فکر کو ابھارتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پطرس کی ہنسی صرف فرحت بخش ہے، اور احساسات کو آہنگ عطا کرتی ہے۔ اس معیار سے دونوں کے مدارج متعین کرنے میں دشواری نہیں ہو سکتی۔ رشید صاحب بغیر کسی کوشش اور ذہنی پس و پیش کے کرداروں کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے آتے ہیں۔ عام سوجھ بوجھ

کو مزاح نگار کا ایک فطری ملکہ کہا گیا ہے؛ اور رشید صاحب کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے۔ ان کی طبیعت میں ایک طرح کی نفسیاتی لاتعلقی کا عنصر ہے۔ انگریزی میں مزاح نگار لیمب کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ اس لاتعلقی کے باعث وہ بعض اوقات خود اپنے آپ کو بھی مضحکہ خیز انداز میں پیش کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔ میریڈتھ نے کہا ہے کہ طربیہ کی روح جس قسم کی ہنسی کی تحریک کرتی ہے اسکو ہم بضرورت شراب سے مشابہت دے سکتے ہیں، جو ہمارے اندر اسی نسبت سے متانت پیدا کرتی ہے جس نسبت سے خوشگواری؛ وہ ہمارے اندر اسی طرح داخل ہوتی ہے جس طرح پڑھنے کے کمرہ میں تازہ ہوا۔ رشید صاحب کے طنز میں ڈنک تو ضرور ہے، مگر وہ ہماری روح کو گھلتا نہیں ہے۔ وہ زندگی کو کسی مصلح کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے، جو برائیوں اور خامیوں سے کسی طرح مفاہمت نہیں کرسکتا۔ وہ زندگی کے سخت و سُست کو ہموار کرنے اور زندگی کو اس کی ساری خرافات، بے تکے پن اور نیک و بد کے باوجود قبول کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ وہ پند و نصیحت، بدباطنی اور حقارت کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور شاید یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ نفسی اصلاح کے لیے یہ حربے بیکار ہیں۔ وہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، اس پر فیصلہ نہیں صادر کرتے۔ وہ انسانی کوتاہیوں، نقائص اور تعصبات پر چیں بجبیں ہونے کے بجائے ان پر شفقت آمیز رواداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں اور انھیں معاف کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی، اشیاء اور انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ترغیب دلاتے ہیں، عقیدوں میں ترمیم کی دعوت نہیں دیتے۔ وہ زندگی کے تضاد کو شاید اس لیے گوارا کرتے ہیں، کیونکہ ان کی آنکھیں ظاہری تضاد سے گزر کر اندرونی توازن کو پالیتی ہیں۔ وہ انسان کی من موجی حرکتوں کی اصلاح ان پر بگڑ کر نہیں کرنا چاہتے۔ وہ زندگی کے رقص پر لب آسا ہنستے ہیں۔ انسانوں کی حماقت زائیاں، مزاح نگار کے طنز کا شکار بنتی ہیں لیکن اس سے ان کے مسلکِ انسانیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ میریڈتھ کا قول ہے کہ تمسخر آمیز شعور کی صلاحیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ان لوگوں میں مضحک پہلو تلاش کریں جن سے ہمیں محبت ہو، لیکن اس طرح کہ ہماری محبت میں کمی نہ آئے۔ رشید صاحب کی طنز و مزاح میں رحمت و آسودگی پائی جاتی ہے۔

رشید صاحب کے یہاں صرف زندہ دلی نہیں ہے جیسی شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے یہاں

پائی جاتی ہے۔ وہ صرف محاوروں اور واقعات سے ہلکا اور سادہ مزاح نہیں پیدا کرتے، جیسا فرحت اللہ بیگ نے کیا ہے۔ ان کے یہاں زندہ دلی اور سادہ مزاحی کے ساتھ شادابی فراوانی، کشادہ قلبی اور گہری طنز بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں بعض جگہ ثقالت بھی آگئی ہے، رشید صاحب کے مزاح کے اعلیٰ نمونے صرف خواص کے لیے ہیں مزاحیہ اشارا اور نقوش کی لطافت اور نزہت میں وہ ہمیں ایڈیسن کی یاد دلاتے ہیں اور قول محال کے برجستہ اور خیال انگیز استعمال میں ان پر چسٹرٹن کا دھوکہ ہوتا ہے۔

ان کے مزاح کو ان کی شخصیت کا اعجاز کہنا چاہیے۔ ان کے یہاں بعض جگہ عربی اور فارسی کی غریب اور نامانوس ترکیبیں بھی ملتی ہیں، جو گراں گزرتی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی ان کی مزاحیہ تحریروں میں ایک نوع کی تازگی، جدت اور صلابت پائی جاتی ہے اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے مضامین ان کی اخلاقی بلندی اور طباعی کا بیّن ثبوت ہیں۔

یہ امر البتہ قابل افسوس ہے کہ "مضامین رشید" کے بعد سے جو بالکل ابتدائی زمانہ میں لکھے گئے تھے، رشید صاحب کے مزاح نگاری کے فن نے کوئی قابل لحاظ ترقی نہیں کی ہے۔ حتیٰ کہ "خنداں" میں تو وہ تقریباً معکوس کے درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ یوں بھی ان مضامین میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ یہ ان کی ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ ہے، جہاں وقت محدود اور گفتگو کو بڑھانے کے مواقع محدود تر ہوتے ہیں۔ مصنف کو اس طرح کی تحریر میں مجبوراً اوکی جگہ صرف بیشتر پر قناعت کرنا پڑتی ہے، اور مشاہدے، تجربے اور فن کی صداقت شگفتگی اور برگزیدگی کی جگہ صرف بیمعنی اور ہمیزہ فقروں اور جملوں کی تکرار اور الٹ پھیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر اس دفع الوقتی کے کام اور ریڈیو پر تقریریں کرنے کی جگہ وہ اپنے طنز اور مزاح نگاری اور اسلوب بیان کو وسعت اور تنوع بخشتے، تو آج بےتکلف اردو کے چسٹرٹن یا ...ڈشا ہوتے۔ لیکن شاید ذہنی کاہلی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے اپنے اندر جتنے کہ سینت سینت کر رکھا اور خرچ کرنا ہی مناسب سمجھا، ورنہ ممکن تھا کہ اردو بلکہ ایشیائی طنز و ظرافت کی صنف میں نادر اور حیرت انگیز اضافے ہو جاتے۔

اسلوب احمد انصاری

رشید احمد صدیقی
نقاد اور نثر نگار

رشید صاحب کی ذہانت کا بہترین اظہار بلاشبہ ان کے قلمی مرقعوں اور مزاحیہ مضامین میں ہوا ہے۔ مگر انھوں نے وقتاً فوقتاً ادبی تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رشید صاحب کی اس حیثیت پر محاکمے سے قبل تین باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ فارسی ادب سے انھیں خصوصی شغف رہا ہے اور اس لیے ان کی ذہنی تربیت اور افتادِ مزاج میں فارسی ادب کی روایات کو بڑا دخل ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بالطبع تاثراتی تنقید نگاری کے مکتبِ فکر سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہمارے یہاں وہ تنقید کے اس مسلک کو عام کرنے والوں میں ہیں جس کے سب سے ممتاز نمائندے مولانا شبلی تھے۔ اور تیسرے یہ کہ رشید صاحب کے یہاں تنقید میں بھی بعض ان اقدار پر زور ملتا ہے، جو ادبی ہونے سے زیادہ تہذیبی اور ثقافتی ہیں۔ رشید صاحب کی تنقیدی مساعی کا اوّلین نمونہ "طنزیات و مضحکات" ہے جس میں طنز و مزاح کے فن کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ چونکہ انھوں نے خود اس فن کو تخلیقی طور پر برتا ہے، اس لیے وہ جائز طور پر دوسروں کی بہ نسبت "رازِ درونِ میخانہ" سے زیادہ واقف ہیں۔ لیکن تاریخ نگاری میں تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار پورے طور پر نہیں ہونے پاتا۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی "باقیاتِ فانی" کا مقدمہ ہے، جو عرصہ ہوا، رشید صاحب نے

لکھا تھا۔ اِسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب نے جو معیار برتے ہیں، وہ تمام تر مشرقی ہیں۔ اس مقدمہ کے دو حصّے ہیں۔ پہلے میں شعر و شاعری کی ماہیت اور شاعر کے منصب اور اس کی شریعت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اور دوسرے میں کلامِ فانی کی خوبیوں پر مفصّل بحث ہے، اور فانی کا دوسرے شعرا، خاص طور پر غالب سے موازنہ کیا گیا ہے۔ موازنے کا وسیلہ ہم معنی اشعار کا پہلو بہ پہلو رکھنا اور اس بنیاد پر نتائج کا استنباط اور استخراج ہے۔ پہلے حصّے میں مندرجۂ ذیل اقتباس دیکھیے:۔

> شاعر کی زبان سے عالمِ بیخودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچ کر ہم کو وارفتہ ہستی کر دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنے دامنِ خیال سے کثافتِ عنصری کا غبار جھاڑ کر اس خاکدانِ آب و گل کی ناسوتی پستی سے بلند ہو جاتے، اور اس عالم میں جا پہنچتے ہیں جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اور اس کی ساری کائنات اور ہم خود صرف ایک دلکش ترانے اور ایک لطیف حقیقت میں گم ہو گئے ہیں۔ جہاں کوئی خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق؛ جہاں جبر ہے اور نہ اختیار؛ نہ سزا ہے نہ جزا۔ جہاں وہ سب کچھ ہے جو ہم جانتے ہیں لیکن کسی طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ جس کی لطافت تابِ اظہار نہیں لا سکتی۔ جس کی رنگین نوائیوں کو لمسِ نظر گوارا نہیں، اور جس کا احساس ایک ایسی نازک، بسیط اور روح پرور کیفیت ہے جو اپنے علم کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ (ص ۲۶)

یہ بیان ایک ایسی ہیئت پسندی کی عکاسی کرتا ہے جو آج کل زیادہ معتبر نہیں سمجھی جاتی کیونکہ یہ خیال کے دھندلکوں پر زیادہ تکیہ کرتی ہے، اور ہمیں نفسِ شعر و شاعری کی قابلِ اطمینان تفہیم عطا نہیں کرتی۔ یہ پورا بیان خاصا مبہم ہے، اور کسی طرح ہماری رہنمائی کا حق ادا نہیں کرتا۔ موجودہ زمانے کا قاری ان تعمیمات کی بہ نسبت زیادہ واضح اور قابلِ اثبات نظریات کو قبول کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تقابلی مطالعے کا جو انداز دوسرے حصّے میں اختیار کیا گیا ہے، وہ البتّہ غالب اور فانی کے فکری اور ذہنی عمل کو سمجھنے میں ہماری اعانت

کرتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا شاید بے محل نہ ہوگا کہ فانی کے یہاں ہمیں ایک طرح کا تعلق ملتا ہے اور غالب کے یہاں حقائق کا فلسفیانہ ادراک۔

"جدید غزل" خطبہ رشید صاحب نے اس وقت دیا تھا، جب وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ بعد میں یہ خطبہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس خطبے میں جدید اُردو غزل کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں غزل کی ماہیت، اس کی روایت اور ان دونوں پر مختلف قسم کے اعتراضات سے بحث کی گئی ہے؛ اور اس کے بعد غزل کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ رشید صاحب کا یہ جملہ کہ وہ غزل کو اردو زبان کی آبرو سمجھتے ہیں ، ایک طور سے ضرب المثل بن گیا ہے۔ انھوں نے حالی سے فراق، بلکہ فیض تک اردو غزل کے ممتاز نمایندوں کے کلام پر اپنے مخصوص انداز میں بعض بلیغ اور چونکا دینے والے اشارے کیے ہیں۔ حالی کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> بڑے شاعروں کی شاعری میں تاریخی تھپکے انسانی تہذیب میں ڈھلتے ہیں۔ شاعر خوابیدہ والوں کی پکار نہیں ہوتی، انسانیت کے خاصان بارگاہ کی فغان نیم شبی اور گریہ سحری ہوتی ہے۔ (ص، ص ۵۸-۵۹)

حسرت کے بارے میں یوں اظہار رائے کیا ہے:

> حسرت سے پہلے اردو کا کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کا محبوب اور جس کی عشق ورزی اتنی سادہ، شائستہ، سرور افزا اور نارمل ہو جتنی کہ حسرت کی۔ انھوں نے اپنی عاشقی کو قصۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا۔ اس کو نہ آسمان پر لیے پھرے، نہ خانقاہوں اور ویرانوں میں بھٹکنے دیا۔ اپنے عشق کو نہ گاؤں سدھار کا میلہ بنایا نہ بغاوت اور انقلاب کا دبیلہ، نہ یزدان و اہرمن کا مسئلہ (ص ۶۴)

جگر کے بارے میں صرف یہ دو جملے قابل غور ہیں:

> عاشقی میں جگر دوری و مہجوری کی عظمت کے قائل ہیں۔ . . . . جگر میں بے پایاں سرشاری اور سپردگی کے ساتھ عشق اور اس کے متعلقات کا جو احساس یا بصیرت ملتی ہے وہ اُن کی شخصیت کو بہت دلآویز اور محترم بنا دیتی ہے۔ (ص ۶۸)

اصغر کے بارے میں کسی قدر زیادہ تفصیل ملتی ہے:۔

> اصغر کی غزل گوئی میں محبوب کی وہ کارفرمائی نہ ملے گی، جو عام غزل گویوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں نزاکت، نغمگی اور نفاست کے ساتھ جو شائستگی، شیرینی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے، وہ نتیجہ ہے اس اعلیٰ تہذیبی کشود و کشید اور بینائی اور دردمندی کا، جسے ہم اردو زبان اور اردو سماج کہتے ہیں
>
> (ص ۱۷۲)

> اصغر کے کلام میں خیالات و جذبات کی جو عفت ملتی ہے اور ان کے اظہار میں شرافت اور متانت کے جن لوازم کو جس کامیابی کے ساتھ وہ برتتے ہیں، وہ کم غزل گویوں کے حصے میں آتی ہے۔ غزل میں بے جھجک ہونے یا لڑکھڑا جانے کی مثالیں عام ہیں، اس حمام میں ستر کا لحاظ کم ہی کرتے ہیں، لیکن اصغر کے یہاں اس کا غیر معمولی احترام و التزام ملے گا۔ (ص ۷۸)

فانی کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے:

> فانی کو موت کا عرفان دوسرے راستوں سے نہ ہوا، غم کے راستے سے ہوا۔ لیکن غم اس کا ہے کہ انھوں نے موت کو اس درجہ ہیجان کیوں قرار دیا۔ غم اور موت شاعری کے بہت بڑے موضوعات ہیں، لیکن فانی کی شاعری میں یہ اتنے بڑے نظر نہیں آتے۔ (ص ۸۲)

> شاعری میں غم کے عنصر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غم ہماری زندگی میں پیوست ہے، غم اور غم گیتی، شاعری اور موسیقی کو تاثیر بخشتا ہے۔ لیکن زندگی، ادب اور آرٹ، غرض ہر عظیم انسانی سرگرمی کو روشنی، رہبری اور رفعت امید سے ملتی ہے، الم سے نہیں۔ انسان غم سے بڑا ہے خدا اور حیات دونوں ابدی ہیں اور خدا یقیناً غم نہیں ہے۔ (ص ۸۵)

> فانی کی شاعری غم و الم کی شاعری ہے۔ لیکن موضوع سے قطع نظر ان کی غزلیں بجائے خود بڑی پاکیزہ سجل اور آراستہ ہوتی ہیں۔ فانی کے یہاں فن اور زبان

کا بڑا احترام ہے۔ ان کا لہجہ بڑا استوار و ہموار ہے کبھی کبھی ان کی تحریں شرافت ان کی تحریں شاعری سے بڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔ (ص ۸۶)

فراق کے بارے میں بھی رشید صاحب کا فیصلہ بہت بے لاگ ہے:

فراق کی شاعری میں عورت کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل ہے۔ جیسے شاعر کی یہ طلب کبھی آسودہ نہ ہوتی ہو۔ عاشقی اور شاعری کے بہت سے پہلو ہیں، ان میں مقبولِ عام وہ ہیں جہاں عاشقی اور شاعری کا محور عورت کا جسم و جمال ہو۔ اس طرح کی شاعری کا بھی ایک مقام ہے، لیکن یہ وہ مقام بلند نہیں ہے، جہاں کسی تہذیب یا تاریخ کا سوادِ اعظم بڑے شاعر اور اس کے مخاطب کی آنکھوں کے سامنے آسکے۔ یہ سوادِ اعظم بڑے شاعر کے بطون میں طوفان بن کر اترتا ہے اور تہلکہ بن کر برآمد ہوتا ہے۔ یہ تہلکہ جذب و جنون کا ہوتا ہے۔ عورت کے جسم و جمال کا نہیں۔ (ص ص ۹۲، ۹۳)

اقبال کے سلسلے میں یہ تین تبصرے قابلِ غور ہیں:

اقبال نے اپنی غزل میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں، ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگِ بنیاد ہے" (ص ۹۷)

انھوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی ہے بلکہ اپنے عقیدے کو فلسفے کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر یہ جامہ عقیدے کے جسم پر جہاں تہاں چست نظر نہیں آتا، تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف نہیں آتا۔ عقیدہ یوں بھی فلسفے کا دست نگر نہیں ہوتا۔ (ص ۹۸)

اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعراء کی نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ؛ بلکہ ایسی زبان اور موضوع اور لہجہ اختیار کیا، جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع، تاثیر، شیرینی و شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فرّ و فرزانگی اور قاہری اور دلبری ملتی ہے، جو مناظرِ فطرت اور صحیفۂ سماوی میں ملتی ہے (ص ۱۰۲)

مندرجۂ بالا اقتباسوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رشید صاحب نے جدید غزل کے اکابر کے بارے میں ان کے کلام کے مطالعے کے دوران چند تاثرات قائم کیے ہیں، جنھیں انھوں نے اس خطبے میں پیش کر دیا ہے۔ یہاں ایک خاص خامی یہ کھٹکتی ہے کہ اقبال کے علاوہ کسی بھی شاعر کے کلام سے مثالیں نہیں پیش کی گئیں، جن سے ان تاثرات کی صداقت متحقق اور مستحکم ہو سکتی۔ دعوے بغیر دلیل کے ہیں! اور شاعری کا تجزیہ کہیں نہیں ملتا۔ اس دوران رشید صاحب نے اور مختلف امور کا ذکر کیا ہے اور اپنے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں بعض معاشرتی حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ رشید صاحب کو عام طور پر تنقید کے ان نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جن کے مطابق ادب اور شاعری ایک عری ا ان نظریات یا شاعر کے کارنامے کو یا نظم کے استعاراتی یا اشاراتی نظام اور داخلی ہیئت اور ریشمی سی طرف کوئی رغبت ہے۔ اس کے برعکس وہ نجی، روایاتی اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں ادیب یا شاعر کے کارنامے کو پرکھنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ بیچ بیچ میں کچھ اہم اور غیر اہم مسائل بھی زیر بحث آ جاتے ہیں، جن کی وجہ سے نظر موضوع سے ہٹ جاتی ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کی نظر میں بڑی بلوغت اور پختگی پائی جاتی ہے۔

غالب کی شخصیت اور شاعری پر محاکمہ رشید صاحب کا تیسرا تنقیدی کارنامہ ہے اور ہر اعتبار سے اسے پہلی دو کوششوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان خطبات کے شروع ہی میں انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "شاعری میں شخص کی تلاش میری بڑی کمزوری ہے"۔ یعنی وہ شاعر کے ظرف، شعور اور قد و قامت کا اندازہ اس کی تخلیقی کاوش کی وسعتوں اور گہرائیوں کی روشنی میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشید صاحب کے لیے ادب کا مطالعہ بڑی حد تک ذوقی چیز ہے اور خوش ذوقی کی دولت، جس میں ذہنی چوکناپن، جذباتی رچاؤ اور حساسیت تینوں شامل ہیں، ہر شخص کے لیے مقدر نہیں۔ ادبی تخلیق کے سلسلے میں تاثرات اور ردعمل کو نہ میکانکی انداز سے تولا جا سکتا ہے، نہ اس کے لیے اعداد و شمار جمع کرنا ضروری ہے۔ غزل کی تنقید میں اور بھی کئی پابندیاں ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی دیومالائی تصور نہیں ہے، فنی اور حیاتیاتی محرکات کی وسیع تکرار، جو نسلوں اور قوموں کے تجربات میں مشترک ورثے کی حیثیت

سے شامل ہو۔ غالب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے سلسلے میں کچھ نئے زاویے مزید تلاش کیے گئے ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں محاکات اور ترنم کے سانچوں کا تعین، یا ادعائے ذات اور رجودیت کے عناصر۔ رشید صاحب نے غالب پر اپنے نظامِ خطبات میں یقیناً اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تعبیرات کو نئی تنقیدی اصطلاحات سے مزین نہیں کرتے، یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ فنِ شعر کی ماہیت یا اس کے اثرات سے اوروں کی بہ نسبت کچھ کم واقف ہیں۔ ان خطبات میں خاص طور پر ہمیں ایک شگفتگی، بیدار مغزی اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔

رشید صاحب غالب اور اکبر دونوں سے ایک طرح کی ذہنی اور مزاجی وابستگی اور ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے اسباب شاید دو ہیں: اول رشید صاحب کے یہاں فکر اور جذبے کی توانائی اور برانگیختگی، اور دوسرے طنز و مزاح کی طرف وہ میلان جو اشیاء اور حوادث و کیفیات کے لیے بے ہنگم پن کو ناپنے کا ایک وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ یہی دو عناصر غالب پر ان کی تنقید میں بھی بروے کار آئے ہیں۔ رشید صاحب نے بہت حسن و خوبی سے یہ بات نمایاں کی ہے کہ غالب کے مزاج میں عجمیت کا عنصر، بحیثیت ایک قومی، ترکیبی عنصر کے موجود ہے:

> وہ شاعر اور شخص، دونوں اعتبار سے عجمی ہیں، عجم کے یزدان و اہرمن، لہراسپ اور جاماسپ، جامِ جمشید، آتشکدوں اور لالہزاروں اور ان سب کے رسم و روایات کی رو سے۔ اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اتنا نہیں، جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔ (ص ۱۸)

> غالب کے کلام میں آتش نفسی کی جو ایک زیرینہ لے ملتی ہے، وہ بھی آتشکدۂ ایران کا تصرف ہے۔ (ص ۱۹)

لیکن یہ عنصر غالب کے یہاں جتنا بھی راسخ رہا ہو، رشید صاحب نے جائز طور پر اس طرف بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کی نشو و نما اور تہذیب و تنقیح میں ان اشراف کی صحبت کو بھی بڑا دخل تھا، جو سیاسی طور پر زوال آمادہ تہذیب کے دور میں دلی کی نوکھ میں موجود تھے۔ مجموعی طور پر شاعری کا ذکر کرتے ہوئے رشید صاحب نے دوسرے خطبے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> لیکن شاعر، ادیب، موسیقار، مصوّر اسی کائنات کی مخلوق ہوتے ہوئے، نئے جہان اور نئی کائنات کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں، جن کے یزدان و اہرمن، ارض و سما، لمس و لذت، کشش و گریز اور حضور و سرور کا خالق خود شاعر ہوتا ہے۔ شاعر کے اس جہان میں ہم ان حقیقتوں، آرزوؤں اور بصیرتوں سے آشنا ہوتے ہیں، جو انسان کے شائستہ ذہن، ذوق اور ظرف کی مستقل اور مسلسل آبیاری اور سیرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب اور ان کی شاعری نے ایک ایسے جہان کی تخلیق کی ہے، جس میں ہماری تہذیبی زندگی کے لالہ کار و تازہ کار رہنے کے امکانات روشن تر ہو گئے ہیں (ص ۵۷)

غالب پر اطلاق سے قطع نظر اس اقتباس کا مقابلہ "باقیاتِ فانی" کے مقدمے کے اس اقتباس سے کیا جائے، جو اس مضمون کے شروع میں دیا گیا ہے، تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رشید صاحب کا نقطۂ آغاز کیا تھا اور وہ اس سے چل کر کس منزل تک پہنچے ہیں۔ عینیت پسندی دونوں جگہ موجود ہے، لیکن وہاں جو ابہام اور بے یقینی کی کیفیت تھی، وہ یہاں ایک روشن بصیرت سے بدل گئی ہے۔

شاعری میں انانیت کا ذکر کرتے ہوئے رشید صاحب نے ایک بہت پتے کی بات کہی ہے:

> کہا جاتا ہے کہ انانیت کا تصور شیطنت کے تصور سے جا ملتا ہے، اور ہر بڑے شاعر میں بقدر ذوق یا ظرف سے "عظیم انحراف" یا شیطنت ملتی ہے۔ اس عنصر کے بغیر ایک اچھا شاعر تو بن سکتا ہے، لیکن عظیم شاعری کی سرحدیں اکثر و بیشتر کافری کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ملیں گی۔ غالب کی عظمت میں اس کافری کا خاصا دخل ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لے اتنی بلند ہوتی ہے کہ غالب منصور سے بھی آگے نکلتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں (ص ۳۹)

رشید صاحب نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ غالب نے غزل کی روایت کو جس میں انفعالیت کا دور دورہ تھا، اور جو سپردگی اور "کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے" سے عبارت تھی، مردانہ وقار اور آن بان عطا کی۔ ان کے بقول غالب کا عشق "وارداتی نہیں، تصوراتی ہے" اور اسی لیے انھوں

نے انیسویں صدی کی غزل کی شاعری میں آنے والے دور کے شعور کی سمت و رفتار کی نشاندہی کی۔ اس ضمن میں رشید صاحب کا یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے:

> غالب کا عشق نہ جنسی ہے، نہ رومانی، وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسنِ نسوانی کے مرقعے نہیں ملتے۔ زلف، کاکل، نگہ اور مژہ کی درازی سے قطعِ نظر انھوں نے اجزائے حسن یا اعضائے حسن کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ آنکھوں کے حسن پر جب کہ متقدمین عش عش کرتے ہیں، غالب سرسری گزر جاتے ہیں۔ دہن غالب کے بہت ہو، رد لب برائے نام۔ لیکن نگہ اور مژہ کی خلش انھوں نے تمام عمر محسوس کی ہے۔ (ص ص ۷۰، ۷۱)

دراصل غالب کے یہاں ایک فکری رفعت، ایک ذہنی بیداری اور تجزیے کی مبہم، پُرپیچ کیفیات پائی جاتی ہیں اور یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن ان کے یہاں ذہنی عمل کی جو اہمیت ہو، اس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا سروکار محض تصورات ہی سے ہو۔ اس کے برعکس ان کے یہاں خیال اور جذبے کا وہ امتزاج پایا جاتا ہے، جو بڑی شاعری کی پہچان اور خصوصیت ہے۔ رشید صاحب کا کہنا ہے:

> یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ غالب محض خیال اور فکر کے شاعر ہیں، جذبے کے نہیں۔ عظیم غنائیہ شاعری میں جذبے کی گرمی نہیں، روشنی ملتی ہے (ص ۷۴)

غالب پر گفتگو کے سلسلے میں رشید صاحب نے اس جذبِ الم کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کے کلام میں ایک موجِ تہ نشیں کی طرح موجود ہے اور جسے حزن کا نام دیا جا سکتا ہے، اور جو متشائم پن کی اور سطحی نشاط کار دونوں سے مختلف اور برتر ہے:

> غالب کا حزن عشقیہ واردات کا نہیں، بلکہ سماجی حالات و واقعات کی پیداوار تھا۔ ان کے کلام میں حزن کی ایک زیریں لے ملتی ہے اور ایک طرح کی شدید نا آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کی حرماں نصیبی ملتی ہے، جس کا بچپن اور ابتدائے شباب شمع و شاہد و شعر و شراب میں گزرا ہو، اور ناساعد حالات کے نتیجے میں خود کو
>
> اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

کا مصداق پاتا ہے (ص ۶۵)

ان کی شاعری کا عام لہجہ حزنیہ ہے۔ حسرت، داغ، تمنا، بلا، برق وغیرہ کے الفاظ جو ان کی شاعری میں بار بار آئے ہیں، وہ اس کی غمازی کرتے ہیں۔ (ص ۶۷)

رشید صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کے تقابلی وزن و وقار کے بارے میں جو اظہارِ خیال کیا ہے، اس میں ایک حد تک تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً پہلے خطبے میں وہ یہ کہتے ہیں:

> میں غالب کے فارسی کلام کو جس میں غزل، قصیدہ، مثنوی سب شامل ہیں، بحیثیتِ مجموعی اُردو کلام سے زیادہ ان کا نمایندہ سمجھتا ہوں ..... کلام کو نمایندہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اعتقادو افکار اور ذہن و ذوق کی جو ترجمانی اور زور بیان و روانیِ طبع کے نمونے ان کے فارسی کلام میں ملتے ہیں، وہ ان کے اُردو کلام میں کم ہیں۔
> (ص ۷۰)

دوسرے خطبے میں وہ یہ کہتے ہیں:

> میری ماہرانہ نہیں، لیکن نیاز مندانہ رائے ہے کہ فارسی میں غالب کا اصلی کمال ان کی مثنویات اور قصائد میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی فارسی غزلیں اپنے تنوع اور شاعرانہ ابلاغ کی وجہ سے ظہوری کی غزلوں سے یقیناً زیادہ کامیاب ہیں۔ اس اعتبار سے ظہوری، خفائی اور غالب ظہوری ہیں۔ تاہم وہ اب تک اہلِ زبان کی نظر میں کچھ زیادہ وزن و وقعت نہیں حاصل کر سکے ہیں (ص ۷۹)

اسی خطبے میں ذرا آگے چل کر کہتے ہیں:

> ان کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنطنہ ملتا ہے۔ لہجہ عام طور پر فکری ہے، استوار اور بھر پور۔ اُردو کلام میں وہ جتنے بے تکلف نظر آتے ہیں، اتنے ہی فارسی میں باادب ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مادری زبان اور اکتسابی زبان میں شاعری کرنے کا کیا فرق ہے۔ اس لیے غالب کے فارسی کلام میں چاشنی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اُردو میں روزمرہ کی لذت اور روزمرہ کا بانکپن ہے۔ فارسی کے اہلِ زبان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کے یہاں جا بجا روزمرہ سے انحراف بھی ملتا ہے (ص ۸۱)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ قصائد اور مثنویوں سے قطع نظر غالب کے فارسی کلام کا وہ معیار نہیں ہے، جو بحیثیت مجموعی ان کے اردو کلام کا ہے۔ فارسی غزل میں غالب کا درجہ اقبال سے کہیں زیادہ بلند ہو، اور امیر خسرو کا غالب اور ہندوستان کے باقی تمام شعرائے فارسی سے۔ غالب کی اردو شاعری میں خیالات کے جو کوندے لپکتے ہیں اور فکر اور جذبے کا جیسا بھرپور امتزاج ملتا ہے، اس کی کوئی جھلک ان کی فارسی غزلوں میں نہیں ملتی، گو ان کے صیقل شدہ ہونے میں شبہ نہیں۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا، اقبال کی فارسی شاعری، غالب کے مقابلے میں خاصی دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اردو شاعری میں اقبال کے یہاں جو تنوع، وسعت اور جدید شعور کی تابناکی اور پہلوداری ہے، غالب کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ رشید صاحب نے اس امر کی طرف البتہ بہت بلیغ اشارہ کیا ہے کہ جہاں ایک طرف اقبال کے یہاں قطعیت ملتی ہے، غالب کے یہاں ایک ظنی (TENTATIVE) اور تجسسانہ (EXPLORATORY) انداز زیادہ نمایاں ہے۔

رشید صاحب نے غالب کے یہاں بعض ایسے اشعار کی ندرت کا ذکر کیا ہے، جو شراب کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔ موضوع گفتگو اگر خمریات کی شاعری ہوتا، تو ان اشعار کی خصوصی تحسین کا جواز ہو سکتا تھا۔ لیکن شاعری کی بڑائی اور بلندی کا انحصار بڑی حد تک موضوع کی بڑائی اور ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔ اور کسی زبان میں بھی بڑی شاعری پامال اور محدود موضوعات کی پابند نہیں ہوتی۔ غالب اور اقبال کی فطانت میں بنیادی فرق ہے۔ غالب کے ذہن اور ادراک کی پیچیدگی اور طرفگی میں شبہ نہیں۔ لیکن ان کی شاعری وقت کی گرفت میں بری طرح اسیر ہے۔ دورِ حاضر کے انگریزی کے ایک ممتاز عالم اور نقاد میٹن نے بڑی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ بڑی چونکا دینے والی بات کہی ہے، "عظیم شاعری وقت کو شکست دینے کی مسلسل جدوجہد کرتی رہتی ہے"۔

It is engaged in a continual struggle to abrogate time.

اس معیار پر پرکھنے سے اقبال کی شاعری بہ نسبت زیادہ عظمت کی حامل معلوم ہوتی ہے۔

یہی حال دانتے، ملٹن، بلیک اور ایلیٹ کی شاعری کا ہے۔ بڑی شاعری ہماری بصیرت اور ادراک کے دریچوں کو اس طرح کھول دیتی ہے کہ ہم وقت کے لمحوں سے گزر کر ابدیت کی اقلیم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ "بالِ جبریل" اور "جاوید نامہ" میں ہمیں اس عظمت کی جھلکیاں ایک سے زائد بار نظر آتی ہیں۔ بڑی شاعری ہمیں ایک معیار اور وسیلہ عطا کرتی ہے۔ جس کے ذریعے سے ہم انسان اور انفس و آفاق کے ربط و تعلق کو متعین کر سکتے ہیں۔ غالب ارضیت کی حدود میں رہتے ہوئے انسانی اَنا کے پیچ و تاب، اس کی حسرتوں اور حیرتوں، اس کے جرأتِ امّ اور ناکامیوں کا ایک لازوال نقش بناتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے نہیں جاتے، شاید جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے یہاں خیر و شر کی پیکار کا کوئی تصوّر ملتا ہے، نہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو جانے کا۔ ان کے یہاں کسی بڑے نصب العین سے وفاداری کا بھی کوئی پرتو نظر نہیں آتا، نہ مذہب کا، نہ ادبیت کا، نہ مظاہرِ فطرت کا۔ رشید صاحب نے بجا طور پر اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غالب ایک محیط کیفیت (Mood) کے شاعر ہیں اور یہ محیط کیفیت متغیر ہوتی رہتی ہے۔ ہر چند انھوں نے غزل کی روایت میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ کیا ہے، اور اسے ایک صلابت، ایک طرفگی اور ایک بھرپور انداز بخشا ہے، لیکن تاہم اس روایت کی حدود ہی اتنی تنگ ہیں کہ ان میں بے پایاں پیدا کرنے کی گنجایش کم، بلکہ ہے۔

رشید صاحب کے یہاں تنقیدی چھان بین کا عمل نہ تو اس پر منحصر ہے کہ فنی، ادبی کارنامے کو تاریخی اور معاشرتی احوال اور تغیرات کی روشنی میں پرکھا جائے، نہ ان کا مزاج اس کا متحمل ہے کہ وہ تواتر کے ساتھ مستقل الفاظ و تراکیب کے اعداد و شمار جمع کر کے ان کی بنیاد پر شاعر کے ذہنی عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اور نہ وہ شعر و ادب کو محض تحت الشعوری کیفیات کی آواز بازگشت کا مرادف قرار دینے کے لیے تیار ہیں۔ کیونکہ غالباً ان کی رائے میں وہ عناصر اور عوامل جو تحت الشعور کے نہاں خانے میں مستور رہیں فنّی کارنامے کی تخلیق میں اس درجے دخیل نہیں ہوتے جتنا کہ بعض اہلِ نظر اس پر مصر ہیں۔ شاعری اور ادب کے طویل مطالعے نے ان کے ذہن اور ذوق کو جس طرح متاثر کیا ہے، وہ بیشتر اسی کی روشنی میں اپنے

ناثرات کو مرتب کرتے اور اپنے فیصلوں کو محکم بناتے ہیں۔

رشید صاحب نے غالب کی شخصیت اور شاعری کی افہام و تفہیم کی جو کوشش ان خطبات میں کی ہے، اس میں انفرادیت اور تازگی پائی جاتی ہے۔ ان کے بعض نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور یقیناً غالب کی شاعری کے بعض پہلو ان کے علاوہ بھی ہیں جنھیں رشید صاحب نے نمایاں کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ لیکن یہ منتخب پہلو جس طرح ان کی گرفت میں آئے ہیں اور جس انداز سے انھوں نے ان پر بصیرت کی روشنی ڈالی ہے اس سے ایک خوشگوار قسم کی حیرت ہوتی ہے۔ رشید صاحب بالطبع مسلسل اور مفصل تجزیے کے عادی نہیں ہیں؛ انھیں بعض ان فنی تدابیر سے زیادہ شغف ہے جن کے ذریعے سے تجربات کی صورت گری کر کے انھیں اہم اور بامعنی بنایا جاتا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے انھیں زندگی اور زمانے کے نشیب و فراز میں جو بصیرت حاصل ہے، اور شعر و ادب کے مختلف شیوں کو جس طرح انھوں نے اپنے شعور و ادراک میں عرصے تک رچایا بسایا ہے، اس کی تراوش کسی نہ کسی انداز میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "ان شعرا (یعنی شعرائے متاخرین فارسی) اور بیدل کے سامنے غالب کی کیفیت ایک 'طفل بدمعاملہ' کی سی تھی" (ص ۵۹)۔ اس اشارے کی بلاغت کی داد کم نظر شاید ہی دے سکیں۔ اور ان سب پر مستزاد رشید صاحب کا ہیرے کی طرح ترشا ہوا، کلاسیکی صحت و حسن کا حامل، رواں دواں، مرصع، مزین اور منفرد انداز بیان ہے۔

رشید صاحب کے فن پر کسی لحاظ سے گفتگو کی جائے یا اس ضمن میں ان کے مخصوص اور منفرد طرز نگارش کا ذکر لابد ہے۔ ان کی تحریر کے حسن و خوبی کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان عناصر اور عوامل پر ٹھہر کر اور اطمینان سے غور کیا جائے، جن سے ان کی تحریریں متصف اور مرتب ہیں۔ اسٹائل یا طرز نگارش کے بارے میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ یہ شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور اس میں لکھنے والے کے ذہن اور مزاج کے تمام نقوش بے کم و کاست جھلک اٹھتے ہیں۔ اس تعریف میں ایک رمزیت ہے، لیکن افہام و تفہیم کے پیش نظر یہ تعریف شرح و بسط چاہتی ہے۔ اسٹائل کی جو مختلف درجہ بندیاں کی

گئی ہیں، وہ ایک حد تک موضوع کے اعتبار سے بھی ہیں، اور وہ مقصد بھی انھیں متعین کرتا ہے، جس کا حصول لکھنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے۔

رشید صاحب کی تحریریں عام طور پر اس تعریف کی ضمن میں آتی ہیں، جسے رغبت دلانے کا فن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اس لیے کہ نہ ان کا مقصد تشریح و تنقیح یعنی وضاحت ہوتا ہے نہ خطابت کے ذریعہ قاری کے اعصاب پر چھا جانا۔ ان کی مزاحیہ تحریروں اور جدید ترین تحریروں میں ایک امر مشترک معلوم ہوتا ہے یعنی ایک نرم کی چبھن اور ایک طرح کا تیکھا پن اور اسی طرح بعض رویوں کو اپنانے کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کرنا جو عام طور پر ان کی تحریروں کی خصوصیت ہو۔ ہم ان کی تحریروں کو اسٹائل کی ایک دوسری قسم کے ذیل میں بھی رکھ سکتے ہیں، جسے **Aculeate style** کہا جا سکتا ہے۔ ایک بار رشید صاحب کی مزاحیہ تحریروں کے سلسلے میں راقم الحروف نے اس رائے کا اظہار کیا تھا، کہ وہ اپنے مزاح کے ذریعے سے کسی اصلاح یا انقلاب کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ ایک معتدل نقطہ نظر کے اپنانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ اس رائے کا اطلاق رشید صاحب کی بیشتر تحریروں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ شعوری طور پر اور براہ راست نہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ الفاظ اور تراکیب کی گرانبار ندرت سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال بھی ناگوار حد تک نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ان کے یہاں وہ معروضیت بھی نہیں ملتی، جو سائنٹفک اور فلسفیانہ تحریروں کا طرۂ امتیاز کہی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں نثر کا آہنگ ایسی زبان کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے، جو بیّن طور پر شاعرانہ اور انتہائی منطقی اظہار بیان کے مابین اپنا وجود رکھتی ہے۔

رشید صاحب کے نثری اسلوب کی ایک خصوصیت جو اکثر توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ صنعت تخالف (**Antithesis**) کا استعمال ہے یعنی اشیاء کی خصوصیات یا پہلو کو یکجا کر دینا جو بظاہر ایک دوسرے کے متنافر ہوں۔ مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھیے جو سب کے سب "مضامین رشید" (طبع اول) سے لیے گئے ہیں۔

آپ کسی چیز، شخص یا موت کا تصور نہیں کر سکتے، جو پاسبانی سے خالی ہو۔ ایک بار

یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا: دو چیزیں ایک ہی جگہ، ایک ہی وقت میں کیسے موجود ہو سکتی ہیں؟ میں نے کہا، کیوں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا کیسے؟ میں نے کہا، اور منطقی کسے کہتے ہیں؟

ہندستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے، اکثر شفا خانے میں، ورنہ جیلخانے میں۔ جیلخانے کا راستہ اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گزرتا ہے اور شفاخانوں کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے، جس پر سے موٹریں بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی (ص ۱۳۵)

گواہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں، وہ گواہ ہے اور کیوں نہیں، عدالت ایک مختصر نمونۂ قیامت ہو اور قیامت صرف ایک وسیع پیمانے پر نمونۂ عدالت۔ فرق صرف یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ، انسانی کمزوریاں یا فرشتے (ص ۱۴۲)

رشید صاحب اپنی تحریروں میں تجنیس صوتی (یعنی صنعت سرحرفی) کے بھی بہت دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس سے کبھی کبھی ظرافت کے اثرات کا حصول بھی مقصود ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر لسانی برجستگی کا:۔

میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا: گھونگھٹ، گندگی اور گہنا۔

تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا سدِ راہ نہ پردہ ہے، نہ پیانو

ایک دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ اور غالب کے پرستاروں
نے ہماری۔

لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو جتنا انقیاد و اطاعت کا ہے، اتنا فکر و تخیل کی
بلندی و برنائی اور عرفان و یقین کا نہیں۔ وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار
سے عجمی ہیں۔

لسانی اور معنوی اعتبار سے ان کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنطنہ ملتا ہے۔

غالب کے غیر معمولی شخص اور شاعر ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے، جب اس کی گواہی
دینے میں ان کے عہد کے تمام معتبر و محترم اشخاص ہم زبان ہیں۔ اعلیٰ ذہن، ذوق اور
ظرف کا جتنا متنوع، ہم آہنگ اور حسین امتزاج غالب کے یہاں ملتا ہے، وہ
باستثنائے اقبال ہمارے کسی اور شاعر یا ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔

عورت کا تصور اکبر، حالی اور اقبال نے عفت، عزت اور عظمت کی جس سطح سے
پیش کیا ہے، وہ کسی دوسرے اردو یا فارسی شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔

اصغر کی غزل گوئی میں محبوب کی وہ کارفرمائی نہ ملے گی جو عام غزل گویوں کے یہاں
نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں نزاکت، نغمگی اور نفاست کے ساتھ جس شائستگی،
شیرینی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے، وہ نتیجہ ہے، اس اعلیٰ تہذیبی کشود و کشید
اور برنائی و برومندی کا، جسے ہم اردو زبان اور اردو سماج کہتے ہیں۔

اس کے باوجود ان (اقبال) کی غزلوں میں تنوع، تاثیر، شیرینی و شائستگی، نزاکت
و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فرہ و فرزانگی اور قاہری و
دلبری ملتی ہے، جو مناظر فطرت اور صحف سماوی میں بھی ملتی ہیں۔

رشید صاحب کی تحریروں میں زور اور توانائی کا سرچشمہ افعال کا استعمال بھی ہے، جس کے
مسلسل اور پے در پے لانے سے مفہوم میں یک لخت حرکت اور رفتار کا احساس پیدا ہو جاتا ہے؛

اور جملے انقاد و خیزاں آگے بڑھنے کی بجائے ایک توقف کی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں، دو مثالیں دیکھیے:

کچھ دیر بعد کمرے سے نکل کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ جھیل میں بادبانی کشتیاں آبی تیلیوں کی مانند رقص کر رہی تھیں۔ دور سے آبشاروں کی اور نزدیک سے ان خوبصورت چڑیوں کی آواز آ رہی تھی، جو ایک طرف لٹکے ہوئے پنجرے میں پھدک رہی تھیں۔ کبھی یہ خیال آتا کہ ان کو آزاد کر دیا جائے تو کیسی مسرور ہوں گی .... سامنے سڑک پر سے قلی گزر رہے تھے۔ ایک تندرست آدمی کو چار کمزور آدمی ڈانڈی میں لیے جا رہے تھے۔ ڈانڈی کا منظر بھی کس درجہ عافیت سوز ہوتا ہے۔

(مضامین رشید، ۲۴۷)

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے، بل کھاتے، پینترے بدلتے، جس کڑک، تڑاپ، غراہٹ اور غلغلے سے بولتے، وہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ بولتے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے تھے۔ دنیا کے ہر حربے کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔ (گنجہائے گرانمایہ: ۴۴)

رشید کی تحریروں کی دلکشی اور معنویت کا راز ایک حد تک اس امر میں بھی ہے کہ وہ اکثر اوقات مشابہات (Analogies) کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھیے، جو مضامین رشید میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں:

جس طور پر حکومت ہند کو آئی، سی، ایس نے مغالطے میں مبتلا کر رکھا ہے، اسی طور پر طبقۂ رؤسا کو مصاحبین اور متوسلین نے گمراہ کر رکھا ہے۔ حکومت ہند نے طبقۂ آئی۔ سی۔ ایس کو اپنا ہاتھ پاؤں ہی نہیں، بلکہ عقل و دماغ قرار دے دیا ہے، اسی طور پر رؤسا کے مصاحبین ہیں، جو ان کے ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اور اعضائے رئیسہ کا بھی کام کرتے ہیں۔ (ص ۱۵۷)

ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے، جو کنگارو کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طور پر کنگارو کا بچہ خطرے کی آہٹ پا کر ماں کی جھولی میں بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے میں نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے۔ (ص ۱۶۳)

سیاسی گماگھر کرسی صدارت پر سب سے زیادہ ہار پہن کر بیٹھتا ہے اور تحریر و تقریر میں صرف پریس اور حکومت کے نمایندوں کو لحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اگر گولیاں چلنے لگیں، یا طوق و رسن کی بادی آجائے، تو پھر اپنے ڈرائنگ روم یا قلعہ کو وہ کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا ہے جتنا مسٹر لائیڈ جارج برطانوی اقتدار کو ارباب آئی، سی، ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں (ص ۲۰۷)

میر مجمو نہایت تندرست آدمی تھے لیکن شکل و صورت سے بالکل ہندستانی دواخانہ۔ ایک سبب یہ بھی تھا جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے (ص ۲۲۳)

مولانا محمد علی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

مرد غازی کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہمی، طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، مال غنیمت اور اسلحہ کی چمک دمک سے نہیں کیا جاتا؛ بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرے، ڈوبتے ہوئے سورج سے۔

رشید صاحب کی تحریروں سے مندرجۂ ذیل اقتباسات غور طلب ہیں :

کھڑکی سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ پل کے طاقوں سے الغاروں مٹیالے پانی کا اینڈتے، گونجتے بخراتے گزرنا اور پل کا اس طغیانی میں میان سے بےخبر و بےپروا ہونا؛ دریا کی دوسری طرف نزدیک ہی قلعے کی سنگین فصیل، دیو پیکر پشتبانوں سے مستحکم، جن پر کہیں کہیں تناور درخت اور کٹیلی گنجان جھاڑیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں، سیلاب کے تند و تیز دھارے سے اپنے ہمدم دیرینہ پل کی طرح بے نیاز؛ پورب کی برسات کا ہر چہار طرف تسلط، سرمئی ملگجے بادلوں کے غلاف کئی کئی دن تک سورج کی روشنی کا راستہ بند رکھتے۔ یہ بادل طرح طرح سے امنڈتے رہتے

کبھی تہ بہ تہ اکٹھا ہو کر ہوا کے جھکڑ میں ایک دوسرے کو رَوندتے پھاندنے لگتے۔ کبھی ان کے گونجنے، گرجنے کی آواز اس طرح سُنائی دیتی جیسے غیب کی آواز دور اور قریب سے یکساں سنائی دے اور قضا و قدر کا کوئی اندوہناک فیصلہ نافذ ہونے والا ہو۔ تاریکی اور تہلکے کی اس دار و گیر میں پل کی سنگین حصار اور قلعے کی فصیل پشتیبان ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے بے ہنگم بادلوں کے بڑے بڑے تودے بغیر کسی خیال کے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیئے گئے ہوں۔

(آشفتہ بیانی میری: ۱۵)

دوسرے دن الہ آباد پہنچا۔ ملدیڈ کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مروت کا وہ پیکرِ مجسم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی ہو۔ زندگی جو عبارت تھی، دوست کی محبت و شیفتگی سے، اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی، برفستانی ہواؤں اور کوہستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

(گنجہائے گرانمایہ: ۱۲۶)

خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ، مختلف فنونِ لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ، اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئیگا۔

(غالب کی شخصیت اور شاعری: ۲۲۵)

مندرجۂ بالا تین اقتباسوں میں پہلا بیانیہ انداز کا نمونہ ہے، دوسرے میں ایک شدید جذباتی ردِ عمل کو معروضیت کے چوکھٹے میں پیش کیا گیا ہے، تیسرے میں ایک تنقیدی محاکمے کو سامنے لایا گیا ہے۔ تینوں میں ایک طرح کی دلآویزی اور تخیل کو چھو لینے والی صلاحیت مشترک نظر آتی ہے۔ اور یہ تینوں اقتباس حشو و زوائد اور شعوری اہتمام و التزام سے منزہ ہیں۔ اس کے باوجود وہ

پڑھنے والے پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان میں تازگی بھی ہے، برجستگی اور لطافت بھی، اور ایک رواں دواں کیفیت بھی۔ ان کی تاثیر کا راز جذبے کی اس کرنمت میں ہے، جسے سطح کے نیچے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بجز پہلے اقتباس کے، جملوں کی ساخت میں پیچیدگی نہیں ہے، لیکن ان کا مجموعی تاثر شادابی، شگفتگی اور صلابت کا ہے۔ سرحرفی صنعت کے استعمال کے سوا، جس میں بعض جگہ شعوری ارادے کا دخل نظر آتا ہے، رشید صاحب اپنی تحریروں کو مرصع اور مزین کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن وہ زبان کے مختلف وسائل پر ایسی دسترس رکھتے ہیں کہ وہ خود بخود ان کے مفہوم کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری، دونوں سے ممتاز اور افضل ہیں کیونکہ ان دونوں بزرگوں نے اردو زبان کے مزاج اور اس کے فطری عمل ارتقا کو غلط راستے پر ڈالنے میں خاصا اہم رول ادا کیا تھا: زبان کو اپنے "ایگو" (انا) کے جارحانہ مظاہرے کے لیے استعمال بھی کیا اور اسے فارسی اور عربی کی ثقیل تراکیب سے گرانبار بھی کیا۔ نثر کے آہنگ کے سلسلے میں رشید صاحب کا براہِ راست تعلق غالب کی روایت سے ہے۔ الفاظ ان کے ہاتھوں میں ایک ایسا معمول اور ہتھیار ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ تجربے کے جزو و کل کے ابلاغ پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اسٹائل کی کوئی ایک تعریف ایسی نہیں ہے، جو جامع بھی جا سکے اور اس کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر سکے۔ پھر بھی اچھی اور معیاری طرزِ نگارش وہی ہے، جس میں جھول اور رخنہ نہ ہو، جو ذہن اور جذبات دونوں کو اپیل کرے، جس میں الفاظ اور معانی مبرم طور پر اور قطعیت کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو گئے ہوں، اور نظم و ضبط کے باوجود شخصیت کی تابناکی، رنگ اور حرارت اس میں جھلکتی ہو۔ رشید صاحب کی بیشتر تحریریں ان تمام محاسن سے پوری طرح آراستہ ہیں، اور اردو زبان میں انشاپردازی کا ایک منفرد نمونہ ہیں۔

گیان چند

رشید احمد صدیقی
بحیثیت معلّم اخلاق

محترم رشید صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ ملا، تو میں نے مبارک باد کی ایک چٹھی لکھی۔ اپنے جوابی خط میں انھوں نے کمال شفقت سے میری رہبری کے لیے ایک بزرگانہ نصیحت کی جو کہ یوں تھی۔

> کچھ بھی لکھتے وقت، خواہ کتنا بڑا Provocation ہو شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ فارسی شعر کو خفیف سی تبدیلی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔
>
> بندۂ علم شدی، ترک نسب کن جامی! کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

نصیحتیں اکثر پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں، لیکن بعض ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ یہ مشورہ میرے دل پر مرتسم ہوگیا ہے کہ کسی قلمی معرکے میں درشت اور دل آزار الفاظ کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ان کی اس نصیحت سے میری توجہ اس پر بھی گئی، کہ رشید صاحب پر لکھنے والوں نے ان کے طنز و مزاح پر تو لکھا ہے، لیکن ان کے ناصح کے روپ پر دھیان نہیں دیا۔ سرور صاحب نے اپنے بعض مضامین میں اس طرف اشارے ضرور کیے ہیں۔

وہ موضوع سے اکثر دور جا پڑتے ہیں، اور ادب اور اخلاق، آرٹ اور

عورت پر لمبی لمبی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں[۱]۔

"انھیں اشخاص کی ذاتی کمزوریوں سے اتنی دلچسپی نہیں، جتنی قومی اور اجتماعی خامیوں سے[۲]۔"

"وہ ادب کو زندگی سے اور زندگی کو معقولیت سے الگ نہیں کرسکتے۔ ..... ان کی انسانیت یا معقولیت ان پر غالب رہتی ہے[۳]۔"

"علیگڑھ کی پرستش کے ساتھ ساتھ وہ انسانیت کی پرستش بھی کرتے رہتے[۴]"

"وہ اپنی انسان دوستی، اخلاقی معیاروں پر ایمان، عوام سے محبت ووابستگی شرافت اور خدمت کی وجہ سے زیادہ ممتاز ہیں اور اس وجہ سے سب سے زیادہ بلند[۵]۔"

"مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انھوں نے جس طرح زندگی میں برت کر دکھایا ہے، کم نے دکھایا ہوگا[۶]۔"

اسی مضمون میں (۳۹۲) سرور صاحب نے رشید صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کوئی شاعر بڑا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو۔ رشید صاحب بڑے مصنف بھی ہیں اور معقول آدمی بھی۔ گویا خود ان کی ذات اور تخلیقات اس کے کلیے کا ثبوت ہیں۔

ان کی تحریروں میں بعض اوقات آفاقی وہ دوامی، خالص اخلاقی حقیقتیں آجاتی ہیں، جن سے صفحۂ تحریر اور قاری دونوں کی رفعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً قدیم ہندستانی ڈھنگ سے کہا جاتا تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک راکشس اور ایک دیوتا ہوتا ہے۔ چاہیے یہ کہ راکشس کو دبا کر دیوتا کو غالب رکھا جائے۔ رشید صاحب نے اپنے الفاظ

۱۔ (خنداں پر تبصرہ) تنقیدی اشارے: ۱۸۴ (طبع سوم ۱۹۵۵ء) ۲۔ ایضاً: ۱۸۶

۳۔ رشید احمد صدیقی (مشمولہ ادب اور نظریہ) ۱۴۷ (۱۹۵۴ء) ۴۔ ایضاً: ۱۴۵ ۔ ایضاً: ۱۴۳

۶۔ رشید احمد صدیقی کی شخصیت (نئے اور پرانے چراغ): ۳۸۹ (طبع چہارم ۱۹۷۲ء)

میں یہی دائمی حقیقت یوں بیان کی ہے[۷]:

> انسان نے ابتدا سے آج تک جو ترقی کی ہے، اس میں اس کے وجود کے حیوانی تقاضوں اور اخلاقی و روحانی صلاحیتوں میں مسلسل جدال یا مازد ستیز ہوتی رہی ہے۔ یہ عمل تا یوم الآخر قائم رہیگا۔ اس میں بحیثیت مجموعی واضح طور پر خیر کو شر، یا انسان کو جانور پر غلبہ رہا ہے۔

وہ زندگی میں بعض اعلیٰ مقاصد، بعض اخلاقی قدروں کو سامنے رکھنے پر زور دیتے ہیں اور ان سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ فرماتے ہیں[۸]:

> جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدے، ادارے، مقصد، یا شخصیت کا احترام اور اس سے بےلوث شغف نہ ہوگا، نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہینگے، نہ کسی دوسرے کے لیے۔

اسی لیے ایک اور جگہ انھوں نے شاگردی استادی، پیری مریدی یا گرو چیلے کے رشتے پر زور دیا ہے، اور یہ رشتہ زندگی اور ادبیات دونوں میں صراطِ مستقیم کی پابندی کا سبب بنتا ہے۔ اقدار کے معاملے میں وہ استقلال پر زور دیتے ہیں[۹]:

> انسان کی صالح اور صحتمند زندگی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں، جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رشید صاحب پرانی قدروں کے پُرزور حامی ہیں۔ انھوں نے ماضی اور اہلِ ماضی کو شدت سے سراہا ہے۔ سرور صاحب نے اس کو مشرقیت کہا ہے۔

۷۔ عزیزانِ علیگڑھ، فکر و نظر (جلد ۱۲۔ شمارہ ۱ و ۲ ۱۹۷۲ء): ۱۶۴

۸۔ سرگزشتِ عہدِ گل (مضامینِ رشید): ۱۹ (۱۹۶۴ء)

۹۔ آشفتہ بیانیِ میری: ۸۷ (۱۹۵۸ء)

ایک مضمون میں لکھتے ہیں:[10]

رشید صاحب پر اقبال کا اثر اچھا نہیں ہوا۔ ان کی مشرقیت اور گہری ہوگئی۔ ماضی کی دنیا ان کے لیے اور زیادہ اہم ہوگئی۔

وہ زندگی میں روایات کی حفاظت پر زور دیتے ہیں:[11]

آج سے پہلے ہمارے نوجوان خاندان کی اعلیٰ روایات کو ایک قیمتی ترکہ سمجھ کر اس کی پیروی یا اس کا احترام کرتے تھے اور معمولی سے معمولی خاندان بھی ایسا نہ تھا جو کسی صالح و صحتمند روایت کا کسی نہ کسی حد تک حامل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہوگئی۔

وہ معاشرے کے مرض کی تشخیص یوں کرتے ہیں کہ پرانی قدریں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے نئی قدریں نہیں ابھریں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انقلاب کی پکار نے مستقل قدروں کو بے وقار کر دیا۔ لکھتے ہیں:[12]

گزشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور اسی پر عمل کیا جاتا تھا اس سے ان میں بےصبری، بے اعتمادی یا غیر ذمہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے، جہاں انقلاب بلانے اور بغاوت کرنے کا اذنِ عام ہو، وہاں ریاضت اور انتظار کو کیا دخل!

انھوں نے طالب علموں اور نوجوانوں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ انسانیت سے گرے، تو قابلِ مواخذہ ٹھہرینگے۔ طالبعلموں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ان کی غیر ذمہ دارانہ حرکات پر ڈانٹ پلائی ہے۔ اپنے طویل خطبے "عزیزانِ علیگڑھ" میں ایک بزرگ معلّم کی حیثیت سے کہتے ہیں:[13]

۱۰۔ ادب اور نظریہ، ۶۴ (۱۹۵۴ء)

۱۱۔ آشفتہ بیانی میری: ۸۶۔ ۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ عزیزانِ علیگڑھ۔ فکر و نظر ص ۱۶۳

> آپ طلبہ سے ڈر کر آپ کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات جو اس طرح پیش کیے جاتے ہیں، جیسے یہ تاوانِ جنگ، بلیک میل یا یرغمال ہو، آپ کے شایانِ شان نہیں۔ ان میں سب سے نامسعود اور عبرت انگیز یہ ہے کہ امتحان کے مقررہ ضوابط اور معیار کو گرا دیا جائے، یا بالکل ختم کر دیا جائے۔

وہ جانتے ہیں کہ نصیحت کرنا کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ اپنی ریڈیو تقریر 'ناصح' میں کہتے ہیں![14]

> نصیحت کے بارے میں ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات بتائی ہے یعنی نصیحت کرنا بڑی بیوقوفی کی بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نصیحت کر دینے کے بعد نصیحت کرنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس پر کسی اور قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس کے باوجود انھوں نے یہ فرض انجام دیا ہے، مضامین میں کہیں کہیں اور خطبوں میں زیادہ تندہی کے ساتھ بزرگی اور منصب کی وجہ سے انھیں بار بار نوجوانوں اور طلبہ کو خطاب کرنے کو بلایا جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر نصیحت کرنے سے مفر نہیں۔ اس قسم کا شاہکار ان کا طویل خطبہ "عزیزانِ علیگڈھ" ہے۔ معلوم نہیں یہ خطبہ واقعی دیا گیا یا محض تحریر کے ذریعے پہنچایا گیا۔ اس میں انھوں نے جم کر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نصیحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ غریب طلبہ سُن یا پڑھ کر گھبرا گئے ہونگے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قیمتی تقریر سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا۔

اس قطع کلام کے بعد عرض کرتا ہوں کہ جوانوں اور بوڑھوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے عدل کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بوڑھوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنی جوانی کو بھول گئے، وہ نوجوانوں سے کیونکر مطالبہ کرتے ہیں کہ نوجوان اُن کی دنیا میں رہیں۔ دوسری طرف، نوجوانوں کو یوں آڑے ہاتھوں لیا ہے:[15]

۱۴۔ ناصح۔ مشمولہ رخنداں: ۳۶۹ (۱۹۶۵ء)

۱۵۔ سلام ہو تجھ پر، مضامین رشید: ۲۷۴

نوجوانوں کا یہ زعم کردہ اسوار شبب دوراں ہیں، اور دوسرے یعنی بڑے بوڑھے
اور کم نوجوان صرف گردِ راہ، ایک ایسا مغالطہ ہے جس میں بعض امراض
کی طرح بچے اور نوجوان ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔

لیکن عدالت کی تمام کوششوں کے باوجود وہ اپنی ترجیح چھپا نہیں سکے:[۱۶]

نئی زندگی اور نیا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی، لیکن ذاتی طور پر میں تو
کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک
کا حاصل، اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی، انسان اور انسانیت
کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعثِ خیر و برکت تھی۔

اخلاق کا گہرا تعلق مذہب سے ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے مذہب اسلام اور ملّت اسلامی پر کثرت سے لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اکثر مضامین اور خطبوں میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کے مسائل اور اخلاق سے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کا اطلاق عام بنی نوع انسان پر بھی ہوتا ہے۔ ان کا خطبہ "عزیزانِ علی گڑھ" صریحاً صرف مسلمان طلبہ سے خطاب ہے، لیکن انھوں نے اس کا تراشا مجھے بھیج کر نہ صرف مجھے مفتخر کیا، بلکہ مجھے راہِ راست پر چلنے کی ترغیب بھی دی۔ انھوں نے اپنی سوانح میں صحیح طور پر لکھا ہے[۱۷] کہ بچپن کے اسکول اور شوالے کی فضا کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے کبھی ہندو معتقدات بلکہ حتی الوسع کسی مذہب پر نہ کبھی نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔ ان کی تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ وہ اپنے ہیرو اقبال کے اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں:

جدا دیں ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کہتے ہیں:[۱۸]

۱۶۔ احسن مارہروی۔ گنج ہائے گراں مایہ: ۱۷۴ (۱۹۶۲ء)

۱۷۔ آشفتہ بیانی میری: ۲۹

۱۸۔ ایضاً: ۶۸

میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی سے سابقہ ہوگا، وہ قابلِ قبول ہے یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی سے سابقہ ہوگا، وہ قابلِ قبول ہے۔

وہ فرقہ واریت کے خلاف ہیں، جن میں اس نقطۂ نظر سے اپنی محبوب درسگاہ کو جو امتیاز دیتے ہیں، اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:[19]

علی گڑھ سے باہر فرقہ وارانہ جھگڑے اور صوبجاتی عصبیت کے جہاں تہاں اکثر مظاہرے ہوتے رہے، لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست و نجاست سے ہمیشہ پاک رہی ۔ ۔ ۔ ۔ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے، یا جہاں کہیں جس حال میں رہے، فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے۔

ان کے عقیدے میں علیگڑھ کی ایک اور فوقیت ملاحظہ ہو۔[20]

مسلمانوں کا صحیفۂ مذہب و اخلاق دوسروں کے صحیفۂ مذہب و اخلاق سے زیادہ ہمہ گیر ہی نہیں سخت گیر بھی ہے ۔۔۔ جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندوستان کے مسلمان ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابلِ تقلید ہیں، نہ کہ اس کا عکس۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بہتر نمائندگی علیگڑھ کرتا ہے۔

مسلمانوں کا صحیفۂ اخلاق دوسرے مذاہب سے زیادہ ہمہ گیر اور سخت ہے۔ دنیائے اسلام میں ہندوستان کے مسلمان بہترین ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں میں درسگاہِ علیگڑھ کے مسلمان بیت الغزل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کو اپنے اصول قائم کرنے کی آزادی

۱۹۔ آشفتہ بیانی میری، ۲۴۴

۲۰۔ سلام ہو تجدید پر، مضامینِ رشید: ۲۷۱

ہے، اور قارئین کو بھی ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کی آزادی ہے۔

وہ مذہب کے بارے میں بہت سخت گیر ہے اور بے لچک واقع ہوئے ہیں۔ وہ مذہب کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انھیں اس کی تاب نہیں کہ مذہب کے احکام عقل کی کسوٹی پر پرکھے جائیں۔ کہتے ہیں:[21]

> مذہب کے دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی، استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔

وہ سیاست کو مذہب سے الگ کر سکتے ہیں، لیکن اخلاق کو نہیں۔ ان کے نزدیک غیر مذہبی شخص اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ ایک طویل مقولہ ملاحظہ ہو:[22]

> اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علاحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جن کی نیت بالعموم بالخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے، اور اخلاق بغیر مذہب عورت بغیر شوہر ہے۔
>
> خود غرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں، جس کی سرحد پھاند کر وہ تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے کے لیے یا مذہب کی پابندی سے اترنے کے لیے جو زینے ہیں، ان میں پہلا اخلاق، پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں۔ مؤخر الذکر تین کا نامسعود اتحاد آج عام انسانیت کا

۲۱۔ ہمارے ذاکر صاحب: ۱۴۸ (۱۹۷۳ء)

۲۲۔ جگر مرادآبادی، گنج گرانمایہ: ۲۴۹

سب سے بڑا آشوب ہے۔

• بیسیوں ہیں، جو مذہب پر تعقل کو ترجیح دیتے تھے، لیکن ہم انھیں بد اخلاق نہیں کہہ سکتے۔ ان کی زندگی میں اخلاق، تہذیب، سیاست اور قومیت، سب کسی نہ کسی درجے میں ملتے ہیں۔ لیکن نجات لازماً نہیں۔ پس ہم خواہ مخواہ یہ فرض نہیں کرسکتے کہ اگر کوئی شخص مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتا تو وہ لامحالہ بدکردار یا بددیانت دار ہوگا۔ اور بظاہر سیاست اور قومیت کا تجارت سے کوئی لازمی رشتہ بھی نہیں۔

اس اختلافِ رائے کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ رشید صاحب مذہب کی روح کے عارف اور ظواہر کے مخالف ہیں۔ مذہب کا لبِ لباب ان کے نزدیک خدمتِ خلق ہے[۲۳]۔

• خدا نے عقائد و عبادت کو خدمتِ خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھیگا۔

اسی لیے وہ محض زاہد و واعظ سے مرعوب نہیں۔ اعلان کرتے ہیں[۲۴]:

میں مذہب کا احترام کرتا تھا مگر مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقاید کی خانہ پری کرکے اعمال کی طرف سے بےفکر ہوجاتے ہیں۔

مذہب کی اس تعبیر (خدمتِ خلق) اور مذہبی زعماء کی اس تشخیص کے بعد ان سے کون جھگڑ سکتا ہے!

اخلاق کا گہرا تعلق ایک طرف مذہبی عقائد اور معبود سے ہے، تو دوسری طرف سماجی برتاؤ اور حق العباد سے۔ رشید صاحب نے اس سلسلے میں جابجا بڑے قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً کھیل کے میدان میں تماشائیوں کو مخالف ٹیم پر آوازے نہیں کسنا چاہیے۔ یونین کے الکشن میں اپنی مذہبی اور اخلاقی برتری کا سہارا پکڑنا چاہیے، نہ کہ

۲۳۔ اپنی یاد میں، مضامینِ رشید: ۸۲
۲۴۔ ایضاً: ۸۲

مذہبی اختلافات اور دوسرے بیرونی مقاصد کا؛ پہاڑوں پر ڈانڈی اور رکشہ میں سفر کرنا انسانیت کے خلاف ہو؛ گفتگو کرنے میں سنجیدگی اور تحمل سے کام لینا چاہیے؛ دعوتوں میں سلیقے سے، بلکہ ہاتھ روک کے کھانا چاہیے؛ لباس کو آرام دہ اور قرینِ حیا ہونا چاہیے؛ نمائش مقصود نہ ہو؛ "مشرقی تہذیب میں سر کو ڈھکے رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ شیروانی اور اچکن میں کسی شخص کو سربرہنہ سڑکوں پر یا تقریبوں میں دیکھتا ہوں، تو اس کی وقعت کافی حد تک نظروں سے گر جاتی ہے"[۲۵] وغیرہ

اخلاق کے ان سماجی پہلوؤں پر انھوں نے بار بار لکھا ہے۔ لباس کے معاملے میں البتہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مردوں کے لیے جس جامے پر وہ رک جانا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:[۲۶]

> قلِ آعوذیت کا میں بھی قائل نہیں، لیکن زنانہ پن یا شہدپن کے مقابلے میں قلِ اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس وجسم کی نمائش یا تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔ مسلمان مردوں کا یہ وطیرہ نہ ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے میں مردوں نے بھی لباس کو نمائش و تزئین کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور رشید صاحب جیسے بزرگوں کی ہیبت سے اس میں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ موجودہ سماج بالعموم اور نئی نسل بالخصوص رشید صاحب کا مشورہ قبول نہیں کریگی۔ اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہے کہ نہیں کریگی، ورنہ دنیا بڑی حد تک بےرنگ ہو جائیگی۔ مردوں، بالخصوص نوجوانوں، کو جامۂ بیرنگ میں ملبوس کرنے سے قبل وہ صنفِ نازک کی رائے بھی معلوم کر لیتے، تو اچھا تھا۔

وہ کھدر کے لباس بالخصوص کھدر کی شیروانی اور پاجامے کو سراہتے ہیں،[۲۷] اور اس کے

۲۵۔ عزیزانِ علیگڑھ۔ فکر و نظر: ۱۶۴
۲۶۔ احسن مارہروی۔ گنجہائے گرانمایہ: ۱۶۴
۲۷۔ ہمارے ذاکر صاحب: ۱۶۶.

اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ کھدر پوشی کی زمانہ گندم نمائی و جو فروشی کے مرادف بن کر رہ گئی ہے۔

وہ سماج کی اخلاقی گراوٹ کے لیے بڑی حد تک انقلاب و اشتراکیت کو ذمہ دار گردانتے ہیں۔

کہتے ہیں[۲۹] کہ اس کی وجہ سے ہر شخص یہ کہنے لگا ہے کہ دوسرے اس کا حق غصب کر رہے ہیں اور اس کے تدارک کے لیے اسے قانون شکنی اور سماج پر لعنت بھیجنے کا حق ہے۔ اشتراکیت سے ان کی خفگی بہت شدید ہے۔ ان کی رائے میں[۲۹]:

> جب سے اشتراکی طریقِ فکر و عمل کا آغاز ہوا، فرد، سماج، ادارے، مذہب، حکومت، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، اقدارِ عالیہ میں ایسا عالمگیر ہیجان، فساد و فتور آیا کہ اب تک کوئی دوسری طاقت اس کو صحت و اعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

سماجی اخلاق کے سلسلے میں انھوں نے بعض موقعوں پر بڑی جرأت کے ساتھ اپنی بعض کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے، جو در اصل ایسی شدید کمزوریاں نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ ہے[۳۰]:

> اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا یعنی میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا، یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو، عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں تامل نہ کرتا تھا۔ الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا، خواہ فریق مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو۔

"اپنی یاد میں" کے عنوان سے انھوں نے 'خاکم بدہن' اپنی وفات (خدا نہ کرے) کے بعد اپنی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ الکشن میں غیر مستحق کو ووٹ دینا ضرور نامناسب ہے'

۲۹۔ عزیزان علیگڈھ، فکر و نظر: ۱۶۵

۳۰۔ اپنی یاد میں، مضامین رشید، ۸۵

لیکن ہمیں یہ ماننے میں تامّل ہے کہ وہ کسی کی حمایت میں عقل و اخلاق سے گزر جاتے ہونگے۔ وہ تو ہر فرد، ہر عمل اور ہر ادارے کو اخلاق کے پیمانے سے پرکھتے ہیں۔ شاعر اور فنکار کے لیے ان کا یہ قول مشہور ہے:[31]

نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آداب کہاں سے آئینگے۔

سرور صاحب کے مطابق رشید صاحب کے بعض فقرے چونکانے والے ہیں، لیکن ان میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے[32]۔ مندرجہ بالا جملے کو بھی انھوں نے انھیں کے جملہ قرار دیا ہے۔ یہ سچ ہی ہے کہ عالمی ادب کے اکابر شعرا پر اس پیمانے کا اطلاق کیا جائے تو یہ یقیناً محلِ نظر ثابت ہوگا۔

جنس اور عورت کے معاملے میں ان کے نظریات بہت محتاط ہیں۔ وہ جنسی جذبے کے مظاہرے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ جنس کے تخلیقی پہلو اور اخلاقی ذمّہ داریوں کے قائل ہیں۔

فرائڈ نے کہا تھا کہ انسانی افعال کے پسِ پشت جنسی جبلّت کارفرما ہے۔ رشید صاحب اس سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:[33]

اس انکشاف نے انسانوں کے اخلاقی اقدار و کردار اور ان کی لائی ہوئی ہزاروں سال کی برکت اور برگزیدگی کو جس طرح مسخ و مسمار اور انسان کی ترقی کی رفتار اور سمت کو جن بد اعمالیوں کی طرف موڑ دیا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

مغرب کی بے لگام جنسی ہوسناکی سے وہ بجا طور پر خفا کی ہیں لیکن ان کا یہ خیال کہ میں[34]

۳۱۔ سید سجاد حیدر یلدرم، گنجہائے گرانمایہ: ۳۵۸۔

۳۲۔ رشید احمد صدیقی کی شخصیت، نئے اور پرانے چراغ: ۳۹۳۔

۳۳۔ عزیزان علیگڈھ، فکر و نظر: ۱۵۰۔

۳۴۔ ایضاً: ۱۵۴

اس ہوناکی کی مخلوق ہیں، صحیح نہیں۔ بہیمیت اختیار کرنے کی بڑی وجہ موجودہ صنعتی تہذیب اور زندگی کی بےمقصدیت ہے۔

عورت کی آزادی اور جنسی معاملات میں وہ قدیم بزرگوں سے ذرا بھی آگے بڑھنے کو تیار نہیں، لکھتے ہیں[۳۵]:

ہر عورت کے فرائض میں ہے کہ وہ اچھی سے اچھی ماں اور بہتر سے بہتر بیوی کا رول ادا کرے۔ شرف و سعادت کا یہ رول صرف اس کے حصّے میں آیا ہے۔۔۔ عورت اور مرد کے مساوی حقوق یا عورت کی آزادی کا کچھ دنوں سے عالمگیر چرچا ہے۔ اس تحریک یا تفریح کے صحیح یا غلط ہونے سے قطعِ نظر اس دشواری کو نظر میں رکھنا پڑیگا کہ جب تک عورت کی جنس اور فطری وظائف یا معذوری کو دور یا دفع نہ کیا جائیگا، وہ مرد کی مدد یا محافظت سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

یہ خیالات اپنی جگہ، لیکن ۱۹۷۵ء میں بپا ہونے والی عالمی خواتین کانفرنس ان خیالات اور دلائل سے مشکل ہی متفق ہو سکتی ہے۔ اگر آج عورت کو صرف ماں اور بیوی کے رول تک محدود کر دیا جائے، تو یہ اسے بیرونِ خانہ دنیا سے بدر کر دینے کے ہم معنی ہو گا۔ متعدد صفِ اول کی عورتوں کی خدمت سے محروم نہیں ہو جائینگے؟

حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب سائنس اور ٹکنالوجی کے آوارہ معاشرے سے بیزار سے ہیں اور بجا طور پر۔ فرماتے ہیں[۳۶]:

"سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے! آرٹ اور آزادی کی قربانگاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے!"

"موجودہ دنیا کی بےیقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فنکار، سائنس اور سائنسدار کو انسان و انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ کبھی

۳۵۔ ایضاً: ۱۵۵

۳۶۔ ڈاکٹر انصاری، گنجہائے گرانمایہ: ۱۹

کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے، جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو حالانکہ ان دونوں کو بہر حال انسانیت کا تابع رہنا چاہیے۔

وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن انہیں مذہب اور اخلاق اور معاشرے کی اقدار اعلیٰ میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ وہ اس تضاد کو نہیں دیکھتے کہ اگر سائنس اور ٹکنالوجی کی راہ پر چلا جائیگا، تو معاشرے کا مذہب اور اخلاق کی دکھائی ہوئی راہ پر قائم رہنا محال ہے:۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ باز می گوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش

قصہ کوتاہ رشید صاحب کے نقطۂ نظر سے جزوی اختلاف کے باوجود ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ہمارا موجودہ سماج اخلاقی اور اقداری اعتبار سے بیراہ روی کا شکار ہو گیا ہو۔ ایسے میں رشید صاحب نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر جو تنبیہیں کی ہیں، ان کے جائز اور برمحل ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ سماجی معاملوں میں ان کے عقائد اور مطالبات نذیر احمد کے نصوح سے ملتے ہیں، لیکن ان کا جزوی اثر بھی ہو جائے، تو یہ بھی اخلاقی اصلاح کی جانب ایک اہم قدم ہوگا۔ مجھے ان کی تحریریں بہت سی ان حقیقتوں اور قدروں کو یاد دلاتی ہیں جنہیں ہم جانتے اور مانتے تو ہیں، لیکن بھول گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مخاطب جوانوں اور طلبہ پر بھی ان کا صالح اثر ضرور ہوا ہوگا، اور ہوتا رہیگا۔

۲۷۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، گنجہائے گرانمایہ : ۲۹۸

سیدہ جعفر

رشید احمد صدیقی کی نثر نگاری

ہنسنا جتنا آسان ہے، ہنسانا اتنا ہی مشکل فن ہے کیونکہ بقولِ برگساں مزاح کا تعلق براہِ راست ذہانت سے ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص بہت آسانی سے ایسی صورتِ حال پیدا کرسکتا ہے کہ دوسرے ہنسنے لگیں ۔ اس میں نہ ذہانت کی ضرورت ہے نہ فنکاری کی ۔ لیکن اعلیٰ طنز و مزاح طبّاعی، قوتِ مشاہدہ، ریاضت اور دیدہ وری کا آفریدہ ہوتا ہے۔ سنجیدہ مشاغل اور سنجیدہ تحریروں میں شخصیت کامیابی کے ساتھ پس پردہ جاگزیں ہوسکتی ہے، لیکن مزاح اور ظرافت میں اکثر اس کی اصلی روح بےنقاب ہوجاتی ہے ۔ ثقہ لطائف مزاح نگار کی شخصیت اور اس کی شائستگی و وضعداری کی اسی طرح غمّازی کرتے ہیں، جس طرح مسخرگی اور ٹھٹھول، اس کے کھوکھلے پن اور سطحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ اردو ادب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کا طنز و مزاح اس کے اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی معیار کا آئینہ ہوتا ہے اور اس آئینے میں اس نسل کے خدوخال آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ان کے سماجی ماحول اور شخصیت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے ۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح نے اردو ظرافت کو وقار و تمکنت سے روشناس کیا اور

سے شایستہ لب و لہجہ عطا کیا۔ انھوں نے اردو مزاح کو تفکّر و تامّل کے آداب سکھائے۔
رشید احمد صدیقی کے یہاں زندگی کا ایک رچا ہوا شعور ہے اور اسی شعور کی مدد سے وہ زندگی کی لغویت اور بے معنویت اور گرد و پیش کے بے ہنگم واقعات، بے اعتدالیوں اور کجرویوں کو محسوس کرتے ہیں، اور انھیں اپنے مزاح کا موضوع بناتے ہیں۔ دقیق مسائل اور سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی فطری ظرافت کے سہارے شگفتہ نگاری کے نئے معیار قائم کیے ہیں۔ ان کی حسّاس طبیعت اور ذہانت نے روزمرہ کے معمولی معمولی واقعات اور غیر اہم باتوں میں بھی ظرافت کا پہلو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ مزاح نگار میں یہ استعداد موجود ہوتی ہے کہ اس کا جذبۂ تفریح زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ اس میں خوش طبعی کا عنصر زیادہ جاندار ہوتا ہے اور اسی کے سہارے وہ واقعات کے سنجیدہ خدوخال میں بھی ظرافت کا جلوہ دیکھتا اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین میں مزاح کی پھلجھڑیاں روزمرہ کے واقعات کے گرد چھوٹتی ہیں۔ "ہوٹل میں ریڈیو"، "سفر"، "دعوت"، "باغ"، "امتحانات" اور "الکشن" میں واقعات کی ظریفانہ مرقع کشی کا ایک خاص ذوق اور سلیقہ نظر آتا ہے۔ یہ ہلکے پھلکے دلچسپ اور پُرلطف مضامین ہیں، جن میں نہ کوئی چونکا دینے والا تجربہ پیش کیا گیا ہے، نہ کوئی فلسفہ طرازی موجود ہے۔ ان میں زندگی کے ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کیے گئے ہیں، جن سے ہر شخص اپنے آپ کو مانوس پاتا ہے۔ لیکن ان کا مضحک پہلو اس کی نظر سے اس لیے پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس میں مزاح نگار کی سی زُود حسی، مردم شناسی اور بالغ نظری موجود نہیں ہوتی۔ اچھا مزاح نگار ذکی الحس ہونے کی وجہ سے بہت جلد اثر قبول کرتا ہے اور اس کا ذہن بڑی سرعت کے ساتھ ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک پہنچ جاتا ہے۔ مزاح نگار کی یہی غیر معمولی صلاحیت اسے عام آدمی سے ممیّز کرتی اور اس کی "عبارت" اور "اشارت" اور "ادا" کو ایک نئی معنویت بخشتی ہے۔

اختصار اور جامعیت رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا جوہر ہے۔ اپنے اکثر مضامین میں

وہ ایک کارٹونسٹ کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے پُر اثر اور دلچسپ اسکیچ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ خاص مواقع اور واقعات کی تصویر ہی نہیں کھینچ دیتے، بلکہ انھیں نظروں کے سامنے متحرک کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں تفصیلی بیانات، جزئیات نگاری اور شرح و بسط سے دامن بچا کے صرف چند اشاروں اور دو چار بلیغ جملوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ کفایت الفاظ ان کی نثر نگاری کا خاص وصف ہے۔ بیکن کی طرح رشید احمد صدیقی بھی کم سے کم لفظوں میں اپنے مطلب کو ادا کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں ظرافت کی ایک وسیع دنیا دکھائی دیتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

• ہمارے محلے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے، گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہو۔

ہندستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے: اکثر شفاخانے میں، ورنہ جیلخانہ میں۔

شاعر کا گویّا اور گویے کا شاعر ہونا کوئی اچنبھے کی بات ہے، نہ بری بات۔ صرف بات کا پھیر ہے۔

اخبار نویس کو بعض عضو اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً آنکھ اس کے لیے بالکل زائد ہے، اس کا کام کان سے لیا جاسکتا ہے۔

۔ مضامین رشید، اور "خنداں" اردو نثر میں شائستہ مزاح اور متوازن ظرافت کے اچھے نمونے ہیں۔ اسلوب کی تازگی اور رچاؤ اور جملوں کی ساحرانہ رمزیت کے علاوہ مصنف کی ادبی ذکاوت اور مزاح نگاری کے فن کو چابکدستی کے ساتھ برتنے کے سلیقے نے ان مضامین کو وقیع بنا دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین نے اُن کی

طالبعلمی ہی کے دور میں اردو داں طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان کی تحریروں میں جدت، البیلاپن اور ادبی حسن ابتدا ہی سے موجود ہے، لیکن بعد کی تحریروں میں یہ رنگ زیادہ چوکھا اور یہ خصوصیات زیادہ پختہ اور نکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعد کے مضامین میں فکر و بصیرت اور رمز و علامت کے لطیف و بلیغ استعمال کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری میں سماجی آگہی کا عنصر زیادہ تابناک اور فنکاری زیادہ گمبھیر اور باوقار انداز میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاحیہ تحریروں سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کا ادبی استعداد اور سماجی شعور سے بدرجۂ وافر بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ ان کا مزاح خالص ادبی مزاح ہے، اور اپنے اس طرز سے انھوں نے نثر نگاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بلیغ اشاروں اور ان کے مخصوص مزاح سے پڑھا لکھا طبقہ ہی پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مضامین کی ادبیت، ستھرے مذاق، برجستہ فقروں اور خلقی ظرافت نے ان کی تحریروں کو ایسی انفرادیت عطا کر دی ہے جو اردو نثر میں ان کے اسلوب سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب سے رشید احمد صدیقی کی گہری واقفیت اور جذباتی وابستگی اور انگریزی ادب کے شاہکاروں سے ان کی دلچسپی نے ان کی مزاح نگاریوں کو ادبیت سے مالامال کر دیا ہے۔ وہ برنارڈ شا اور چسٹرٹن کے مداح ہیں اور ان کی تحریروں میں قولِ محال کا برجستہ اور برمحل استعمال ہمیں آسکر وائلڈ کی یاد دلاتا ہے۔ غالب کے اشعار، ان کے استعارات اور ترکیبوں اور اقبال و اکبر کے طرز ادا سے اثر پذیری نے ان کی تحریروں کو مزاح اور ادبیت کا ایک خوشگوار امتزاج بنا دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی بعض تحریروں پر ادبیت اور علمیت اتنی غالب ہے کہ ان کا "ہر سخن اک مقام" سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> عوام کا خیال ضروری ہے، لیکن ہر دفعہ کیا ضروری ہے کہ جو ہماری اصطلاحوں سے نا واقف ہو اسے ہمار... ... ہر یادوں سے کھیلنے دیا جائے۔

"مضامین رشید" میں مقامی رنگ زیادہ ہے اور "خنداں" میں یہ اثر کم محسوس ہوتا ہے۔ "خنداں" کے مضامین میں عنوانات کا تنوع ان کے وسیع تجربے، انسانی مسائل سے دلچسپی اور زندگی کے جلوۂ صد رنگ کے ادراک کا مظہر ہے۔ رشید احمد صدیقی کی اکثر تحریروں میں علیگڈھ کی روایات سے والہانہ وابستگی اور اس کی مخصوص فضا سے جذباتی لگاؤ، موضوعات میں یکرنگی پیدا کر دیتی ہے۔ ایک خاص ماحول کی عکاسی میں اختصاصی اہمیت اختیار کرنا اور ایک مخصوص فضا کا رمز شناس بننا کوئی قابل اعتراض بات نہ سہی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی تحریروں میں علیگڈھ کے طلسمی حصار کے باہر وہ اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں۔ اس فضا کا ان کی سیرت و شخصیت اور ادبی مزاج کی تعمیر و تشکیل میں جو اہم مقام ہے، "آشفتہ بیانی میری" میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند و ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی شخصیت کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علیگڈھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر و تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا، لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنیٰ علیگڈھ نے دیے۔

بعض نثر نگاروں کے پیش نظر ان کا اپنا ایک نصب العین ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنے فن کو گرمی اور توانائی عطا کرتے ہیں اور اس کی رگوں میں خون پہنچاتے ہیں۔ علیگڈھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا ایک زبردست محرک محسوس ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ہر شخص اپنا محبوب اور اپنا عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہے۔ میرے عہد میں یہ آزادی تھی۔ لیکن ہے آپ کے عہد میں نہ ہو اور آپ اس پر مجبور ہوں کہ دوسرے آپ کے لیے محبوب اور معتقدات متعین اور منتخب کریں۔

بعض اوقات رشید احمد صدیقی پر تنقید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو

ایک خاص نصب العین کا پابند بنا کے اپنے موضوعات کو محدود اور اپنے مزاح کو ایک خاص دائرے میں مقیّد کر لیا ہے؛ اور اس "مقامیت" پر انھیں سطحیت کا گمان بھی ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" اور "مضامین رشید" میں لکھا ہے کہ علیگڈھ سے جو انگنت تجربات انھوں نے حاصل کیے ہیں، وہی ان کا سرمایۂ انبساط اور مزاح نگاری کی اصل روح ہیں۔ ایسا مزاح جس پر مقامی رنگ کی چھاپ بہت گہری ہو، مکانی بُعد اور فاصلوں کی زیادہ تاب نہیں لاسکتا۔ یہی وجہ ہے، ان کے مضامین سے وہی افراد کما حقّہ، محظوظ ہو سکتے ہیں، اور اُن کے پُر لطف اشاروں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں، جن کا علیگڈھ سے قریبی تعلق ہو۔

رشید احمد صدیقی نے تہذیبی مسائل اور سنجیدہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور ان مضامین میں بھی اپنے مخصوص اسلوب کی دلفریبی کو برقرار رکھا ہے۔ "سلام ہو نجد پر"، "دل پھر طواف کوے ملامت کو جائے ہے" اور "جگر میری نظر میں" ان کی ایسی تحریریں ہیں، جن میں مزاح کی چاشنی بھی ہے، اور ادبیت کی شان بھی۔ ان کے تنقیدی محاکمے، فنی تجزیے سے زیادہ شخصیت کا مطالعہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں مصنّف کے دو ٹوک فیصلوں اور ان کی آزادہ روی اور اس کے منفرد طرزِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایسی پُر لطف نگارشات ہیں، جن میں تفکّر و بصیرت کا عنصر بھی ہے اور ظرافت کی سحر آفرینی بھی۔

ان کے مضامین میں طنز کی کاٹ بھی ہے، لیکن ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ طنز تلخ نوائی، استہزا یا پھبتی کی شکل نہیں اختیار کرتا۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں ایک دبا دبا یا سا طنز ہمیشہ موجود ہوتا ہے، لیکن ان کا اصلی فن مزاح نگاری میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ ایل۔ جے۔ پاٹس نے طنز و مزاح کے نازک فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> مزاحیہ، المیہ کی طرح، طنز سے نہ صرف مختلف ہوتا ہے بلکہ اعلیٰ معیار کا حامل بھی۔ . . . جب کوئی طنز نگار مزاح پر توجّہ صرف کرتا ہے، تو اس کی فکر زیادہ بالغ اور اس کا فن سچائی پر مبنی ہوتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے خیال میں طنز و مزاح دو مختلف ادبی عناصر ہیں۔ وہ ان کے باہمی ربط کے کچھ زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ طنز و مزاح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ وہ دو علیحدہ علیحدہ رجحانات ہیں، اس لیے ان میں ارتباط اور ہم آہنگی کی تلاش بے سود نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے زیادہ مشکل فن ہے۔ ظرافت کے لیے خوشدلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے؛ طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

نارمن فرلانگ اپنی کتاب انگلش سٹائر (English Satire) میں طنز و ظرافت کو شائستگی کی پرکھ کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے، اس لیے کہ طنز و مزاح کے دوران شخصیت کو بےنقاب ہونے کا اچھا موقع فراہم ہوتا ہے؛ اور اس طرح یہ تہذیبِ نفس، شرافت اور شائستگی کے متعلق بدا ہے قائم کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریریں نفیس، تربیت یافتہ اور ستھرے مزاح کا مقبول اور پسندیدہ نمونہ ہیں۔ مزاح ہمیں ایک ایسے احساس سے ہمکنار کرتا ہے، جو نہ صرف سماج کی منتشر، غیر معتدل اور غیر متوازن طاقتوں کے خلاف صف آرا ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی فرد کے ذہن اور اس کی شخصیت کی کجروی کی بھی اصلاح کر سکتا ہے۔ انھوں نے فرد اور سماج دونوں کو اپنے مزاح کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے طرزِ تحریر کی خوبی یہ ہے کہ مقصدیت کہیں مزاح پر غالب نہیں آتی۔ ان کا مزاح بہر خوشی اور جدت سے مالامال ہے۔ رشید احمد صدیقی کی ظرافت، دانشمندی اور ذوقِ آگہی کا سرچشمہ ہے اور قاری میں رجائیت کے احساس کو تقویت دیتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ان کا سیاسی اور سماجی شعور اُجاگر نظر آتا ہے لیکن

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے تحریکات سے کم اور افراد سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ خلافت تحریک اور ترکِ موالات ان کے ابتدائی عہد کی اہم تحریکیں تھیں۔ انھوں نے برطانوی سامراج اور پارلیمان پر کہیں کہیں لطیف طنز کیا ہے۔ ان کا روئے سخن دراصل ان افراد کی طرف ہے جو ظاہر پرستی، مفاد پسندی اور تصنع کا شکار ہیں۔ خود غرض اور موقع پرست لیڈروں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اصل لیڈر نہ مار کھاتا ہے اور نہ مرنا گوارا کرتا ہے۔ لیڈر مار کھانا شروع کردے، تو پھر قوم کی رہبری کون کرے! مار کھانا اور رہبری کرنا دونوں کام ایک ہی لیڈر سے کیونکر سرانجام پا سکتے ہیں ...... تاہم یہ دستور چلا آتا ہے کہ مار کھانا قوم کا حق ہے اور مار سے بچنا لیڈر کا فرض۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح میں تمدنی تنقید کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔ وہ ہیئتِ اجتماعی کی ناہمواری، اس کے عدمِ توازن اور لغویت کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اور ان کو اکثر جگہ انھوں نے اپنے مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ مزاح کے لیے ماحول اور زندگی کے منفی پہلو پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ لی کاک مزاح کو افراد کی تربیت اور سماج کی تعمیرِ نو کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری بذلہ سنجی کی رہینِ منت نظر آتی ہے۔ ان کے برجستہ فقرے اور برمحل اشارے تضاد اور مماثلت کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کردیتے ہیں۔ وہ فقرے تراشنے اور اندازِ بیان کے سہارے عبارتوں کو دلنشین بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں، اور اس خصوصیت نے بھی ان کی بذلہ سنجی کو آب و تاب عطا کی ہے۔ "زود حس"، تیز ادراک، اور طباعی و ذہانت، ان کے فن کے معاون محسوس ہوتے ہیں۔ چیسٹرٹن کی طرح بعض اوقات وہ مختصر عبارتوں میں مزاح، بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کے جوہر سمو کر قولِ محال کا لطف پیدا کردیتے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

> جہاں اپنی عقل کام نہ دے، وہاں دوسروں کی حماقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

"جھوٹ بولنے کی وہاں زیادہ ضرورت پڑتی ہے، جہاں آپ سچ بولنے کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں"۔

"ڈاکٹر نہ ہوں تو موت آسان اور زندگی دلچسپ ہو جائے"!

"آج کل سب سے زیادہ آسان کوئی بات ثابت کر دینا ہے۔ دس بیوقوف کسی بات پر متفق ہو جائیں، تو وہ بات ثابت ہے"۔

"مضامین رشید" کی اشاعت پہلے عمل میں آئی، اور "خنداں" کی بعد ازاں، لیکن نقشِ اوّل نقشِ ثانی سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ "مضامین رشید" میں مصنف کے طنز و مزاح کی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ "خنداں" کے مضامین دراصل ریڈیائی تقریریں ہیں۔ ریڈیائی تقریروں میں بعض تحدیدات اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں وہ "اندازِ گل افشانیٔ گفتار" نہیں ملتا جس نے ان کی دوسری تصانیف کو نظر فریب اور دلکش بنا دیا ہے۔

خوجی، چچا چھکن اور حاجی بغلول اُردو ادب کے ایسے مزاحیہ کردار ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں اس قسم کی کردار نگاری نہیں ملتی۔ ان کا فن بلیغ اشارات اور ظرافت کی رچی ہوئی حس کا آفریدہ ہے۔ ان کے مضامین میں روشن خیال بیوی، حاجی بلغ العلیٰ، مولوی، بابو، آئی، سی، ایس اور مرشد (ذاکر حسین صاحب) ایک خاص پس منظر اور ایک مخصوص معنوی فضا کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ ایسے مستقل کردار بن کر ہمارے سامنے نہیں آتے، جو حاجی بغلول، چچا چھکن اور خوجی کی طرح ادب کی ایک زندہ علامت بن جائیں۔

رشید احمد صدیقی کی تصانیف "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہمنفسان رفتہ" اپنی خوبصورت اور پُر اثر مرقع نگاری کی وجہ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اُردو نثر میں مرقع نگاری کا فن بھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ شخصیتوں کا عکس پیش کرنے اور ان کی سیرت کے اہم خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوشش یوں تو تذکروں میں بھی موجود ہیں، لیکن ان میں وسعت تاثر نہیں ہے۔ تذکروں میں شخصیتوں کے بارے میں سرسری اور اچٹتے ہوئے اشارے

ضرور دکھائی دیتے ہیں، جن کو پیش کرنے کا مقصد سیرت کے بعض گوشوں کو بیتاب کرنا ہے۔ مرقع نگاری خاص شخص کی سیرت کی دھوپ چھاؤں، اس کی عادات و اطوار اور کردار کے سیاہ و سفید کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے، جو اپنے اختصار اور ایجاز کے باوجود اس شخصیت کے بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرلے۔ رشید احمد صدیقی کی تصنیف "گنج ہائے گرانمایہ" میں مرقع نگاری کی بہت سی اہم خصوصیات جمع ہوگئی ہیں۔ انھوں نے ایسی شخصیتوں کو منتخب کیا ہے، جنھیں انھوں نے قریب سے دیکھا تھا، اور جن کی سیرت کے صحیح خدو خال ان کے سامنے تھے۔ انھوں نے ان اشخاص کی سیرتوں کے آثار، ان کی عادات و اطوار، ان کے حلیے، ڈیل ڈول، اور خوب و زشت کی ایسی متحرک اور گویا تصویریں پیش کردی ہیں، جو اُردو نثر میں ایک عرصے تک مدھم نہ ہوسکیںگی۔ رشید احمد صدیقی اچھی مرقع نگاری کے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ جن افراد کے چہرے پیش کیے جائیں، وہ اپنے تمام کمالات اور اپنی ساری چھوٹی بڑی کمزوریوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوں۔ وہ انسان کو فرشتہ یا شیطان بناکے پیش کرنے کے قائل نہیں۔ رشید احمد صدیقی انسان کی انسانیت اور اس کی بشری خصوصیات کی تصویرکشی کو مرقع نگاری کا اصلی جوہر سمجھتے ہیں۔ معیاری خاکا نگاری میں زیر بحث کردار کی افتاد طبع اور خصائل کی تمام اہم خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں نہ مدح سرائی کا انداز ملتا ہے، نہ ہجو کی سی انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ انھوں نے شخصی تعصبات سے بلند ہو کر حقیقتوں کو بے کم و کاست بیان کردیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دولتمند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے! نہ انھیں جوڑ توڑ آتا تھا۔ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار، نہ خوش باش! نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی سے بھی زیادہ معمولی آدمی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں کوئی ویسا نہیں، اور نہ اب ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا ملے۔ سیاہ فام، چیچک رُو، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیرے۔ بہتے، تو غلام بن جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ایّوب کی خوبیوں نے ان کی بدصورتی کو کس درجہ

دلآویز بنا دیا تھا۔

رشید احمد صدیقی نے شخصیتوں کے مرتبے اور مقام سے متاثر ہوئے بغیر محض اپنی وابستگی اور ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ جہاں انھوں نے مولانا محمد علی، ابو الکلام آزاد، اقبال اور ذاکر حسین کے مرقعے پیش کیے ہیں، وہیں کالج کے ایک چپراسی کندن کی شخصیت کو بھی انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ شخصی وابستگی، ذاتی ربط وضبط، تعلقات اور نجی واقفیت نے ان کے مرقعوں کو پُراثر، کامیاب اور جامع بنا دیا ہے۔ ان افراد کی سیرت، نجی زندگی، ان کے معمولات اور ان کے کردار سے پوری طرح آگاہ ہونے کی وجہ سے شخصیت کے بعض ایسے گوشوں پر اُن کی نظر پڑتی ہے، جو سوانح نگار اور محقق کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی روز مرہ کے غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے شخصیت اور سیرت کا تجزیہ کرتے اور ان کی بنیادی خصوصیات کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مُرقع نگاری کا فن بصارت اور بصیرت دونوں کا متقاضی ہے۔ سوانح نگار حقائق جمع کرنے اور انھیں زمانی ترتیب میں پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہے، جب کہ مرقع نگار زندگی کے ہر واقعے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ وہ زندگی کے رنگا رنگ جلوؤں کا تماشائی ضرور ہے، لیکن ذوقِ نظارہ کو کثرت کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہونے دیتا۔ مرقع نگاری اختصار و ایجاز کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ یہ تفصیل کا فن نہیں، بلیغ اشاروں اور رمز و ایما اور تہہ داری سے ابلاغ کا فن ہے۔ مرقع نگاری سروں پر تاج رکھنے یا گردن قلم کر دینے کا نام نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کا بنیادی مقصد روشنی اور سایے کے امتزاج سے شخصیت کی جیتی جاگتی اور بھرپور تصویر پیش کرنا ہے۔ اچھی مرقع نگاری زمان و مکان کی دوری برداشت نہیں کر سکتی، وہ شخصیت کا قرب چاہتی ہے۔ اس لیے ہر ادب میں خاکہ نگاری کے بہترین نمونے وہ ہیں، جنھیں معاصر مصنفین نے جذباتی اور ذہنی رفاقت اور قرب و مؤانست کے سہارے ایجاد کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" میں جن اشخاص کی تصویر کشی کی ہے، ان سے کسی نہ کسی

زمانے میں ان کا قریبی ربط اور تعلق رہا ہے۔ لہٰذا ان کی معلومات سماعی نہیں، اور اسی لیے وہ قیاس آرائی پر تکیہ نہیں کرتے، بلکہ اپنے مشاہدات و تاثرات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں صداقت پسندی اور حقیقت نگاری کا عنصر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ وہ جاہ و منصب یا اثر و اقتدار کو شخصیت سے قرب حاصل کرنے کی ضروری شرط تصور نہیں کرتے، بلکہ انسانی فضائل، خوش اخلاقی اور اعلیٰ اقدارِ حیات سے وابستگی کو دوستی اور ہمنشینی کی وجہ تحریک سمجھتے ہیں۔ "ذاکر صاحب" میں لکھتے ہیں:

> میں دوست کے نعائم و فضائل پر مرتا ہوں، نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر۔ اس لیے کہ اثر و اقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہو سکتا ہے، لیکن فضائلِ نفس وہ نعمت ہے، جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔

بعض خاکہ نگار اپنی اہمیت منوانے یا قاری کے دل پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کو اہم سیاسی اور ادبی شخصیتوں سے اپنے دوستانہ تعلقات اور بےتکلف صحبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اصل کسی خاص شخصیت کی مرقع نگاری نہیں، بلکہ اپنی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جہاں ہندستان کی عظیم شخصیتوں کے مرقعے پیش کیے ہیں، وہاں اپنی انا کی تسکین کا سامان نہیں فراہم کیا ہے، بلکہ زیرِ بحث شخصیت کے خد و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر انھوں نے کہیں اپنا ذکر ضروری بھی سمجھا ہے، تو محض اس شخصیت کی سیرت کے مخصوص گوشوں کو نمایاں کرنے کے لیے۔

رشید احمد صدیقی کے مرقعوں میں بعض جگہ شخصیت کا مطالعہ معروضی نہیں رہا۔ اور ان کا لہجہ تاثراتی اور جذباتی ہو گیا ہے۔ اپنے اکثر خاکوں میں جہاں وہ انسان دوستی، حسنِ سیرت، دلسوزی اور جذبۂ اخلاق کا ذکر کرتے ہیں، وہیں عقیدتمندی، شخصی پسند و ناپسند اور ماسیر و پرستی ان کی تصویروں کو یکسر تاثراتی بنا دیتی ہے۔

انھوں نے اپنے مرقعوں میں سیرت کے انہی پسندیدہ پہلوؤں اور خصوصیات پر زور دیا ہے اور ان میں وہ انہی اخلاقی قدروں کے متلاشی ہیں، جنھیں وہ خود عزیز رکھتے ہیں۔ انھی شیلی کا دپر کی کامیاب خاکا نگاری کا راز یہی ہے کہ اس نے انہی شخصیتوں کی مرقع کشی کی ہے، جن میں اسے اپنی سیرت اور اپنے پسندیدہ انسانی اوصاف کا پرتو نظر آیا۔

"شیش محل" میں شوکت تھانوی نے اپنے بعض ہمعصروں اور دوست احباب کے جو خاکے پیش کیے ہیں، وہ دلچسپ اور پُر لطف ضرور ہیں، لیکن ان میں سیرت کے مختلف رُخوں کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کا فقدان نظر آتا ہے۔ ظرافت کی بہتات اور قہقہے لگانے کی عادت نے انھیں سنجیدہ غور و خوض سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لیے "شیش محل" کے خاکے شخصیت کی حقیقی تصویریں نہیں، کارٹون ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنی مرقع نگاری میں ظرافت کے ذریعے سے ایک پُر لطف، شگفتہ اور انبساط پرور کیفیت ضرور پیدا کر دی ہے، لیکن "خندہ ہائے بیجا" سے احتراز کیا ہے، جس سے اُن کے مرقعے سیرت کے سنجیدہ مطالعے اور افادیت سے بہرہ مند نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شخصی تاثرات، سیرت کے ذاتی مطالعے اور منصفانہ و حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر نے ان مرقعوں کو اُردو نثر کے نگار خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے طرزِ تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتیں معنی و مفہوم کے اعتبار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے شخصیت کے وہ گوشے بھی نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جو بعض اوقات سیرت کے کمزور پہلوؤں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اپنے فیصلوں میں کتنے اٹل اور اپنی بات کے اظہار میں کتنے بیباک ہیں۔

وہ سیاق و سباق کی تبدیلی سے ترسیل و اظہار کے لطیف پیرایے پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی لفظوں کے اچھے نباض اور رمز شناس ہیں۔ ان کے یہاں خیال کی لالہ کاری بڑی حد تک لفظوں کے حسن اور فقروں کی جادوگری کی رہینِ منت ہے۔ بیساختہ، رواں، دلنشین اور خوبصورت اندازِ بیان نے ان کی مزاح نگاری میں جان ڈال دی ہے۔

ان کا طرزِ تحریر اپنی انفرادیت، شگفتگی، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ لطیف و شیریں فارسی ترکیبوں اور اساتذہ کے اشعار کے منتخب الفاظ اور اور اظہار کے پیکروں نے رشید احمد صدیقی کی نثر کو ایک نئی حلاوت، دلکشی اور دل آویزی عطا کی ہے۔ ان کے یہاں خطابت کا رنگ کہیں کہیں ذرا گہرا بھی ہو گیا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے اصل موضوع سے بے اعتنائی بھی برتتے ہیں۔

مزاحیہ مضامین میں اندازِ بیان اور اسلوب نگارش کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ظریفانہ تحریروں میں مزاح کا انحصار ایک خاص حد تک الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی برمحل نشست پر بھی ہوتا ہے۔ اگر مزاح نگار برجستہ اور موزوں الفاظ کا انتخاب نہ کر سکے، بلیغ فقروں اور لطیف اشاروں سے کام نہ لے، تو ممکن ہے کہ بسا اوقات وہ مضحکہ خیز واقعات اور مواقع کو بھی ظریفانہ رنگ دینے سے قاصر رہے۔ رشید احمد صدیقی کی ظرافت کا انحصار واقعات کی ترتیب اور ان کے محل وقوع کے ساتھ ساتھ مصنف کے تبسم ریز فقروں اسلوب کی گدگداہٹ اور مخصوص لفظیات پر بھی ہوتا ہے۔ وہ ضرورتاً مزاحیہ الفاظ ڈھال بھی لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم کو "بیمہ کا ایجنٹ"، "اگر ڈاکٹر نہ ہوتے"، "اگر میں فاونٹن پن ہوتا"، "ایڈیٹر"، اور "پاسبان" سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے الفاظ اور ترکیبیں وضع کرنے میں انھوں نے عربی اور بالخصوص فارسی سے بہت مدد لی ہے۔ وہ اپنے دور کے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں، جن کی تقلید آسان نہیں۔

سلیمان اطہر جاوید

مکاتیبِ رشید احمد صدیقی
ایک مطالعہ

مکاتیب کا شمار ادب ہی میں نہیں، ادبِ لطیف میں بھی ہوتا ہے، اور اگر اچھے مکاتیب ہوں، تو ان کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہونا چاہیے۔ اردو میں جن ادیبوں کے مکاتیب فنونِ لطیفہ کی آبرو میں اضافہ کرتے ہیں، ان میں رشید احمد صدیقی بھی ایک ہیں۔ ایک اچھا مکتوب اچھی غزل کی طرح ہوتا ہے، پُرکیف اور دلپذیر۔ رشید صدیقی نے یہاں وہاں غزل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ سب کم و بیش اچھے مکاتیب کے بارے میں بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً "غزل شاعری نہیں، تہذیب بھی ہے"۔۔۔۔ یا۔۔ "غزل فن ہی نہیں، افسوں بھی ہے"۔۔۔ یا "غزل صنفِ سخن ہی نہیں، معیارِ سخن بھی ہے"۔ یا "غزل ریزہ کاری میں مینا کاری ہے"۔ یا "غزل کو میں فن نہیں، اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں" وغیرہ۔
اچھے مکاتیب سے مُراد کاروباری نوعیت کے مکاتیب نہیں، نہ وہ محض رسمی طور پر تحریر کیے جاتے ہیں، بلکہ وہ مکاتیب ہیں، جو لادواً لکھے نہیں جاتے، بلکہ صاحبِ مکتوب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کو لکھ جائے۔ کاروباری مکاتیب کا دائرہ معیّن اور محدود ہوتا ہے۔ رسمی مکاتیب "برائے مکاتیب" کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ اس لیے تحریر کیے جاتے ہیں کہ ان کا تحریر کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ کچھ ہمارے تہذیبی تقاضے اور رواہ و رسم کی پابندیاں ایسی ہیں کہ انھیں لکھنا ہی پڑتا ہے۔ انسان ایسے مکاتیب میں مجبور اور "محدود" سا ہوتا ہے ۔۔۔ لیکن

وہ مکاتیب جو آپ ہی آپ لکھے جاتے ہیں، ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں۔ لکھنے والا انھیں غیر شعوری طور پر لکھ جاتا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ قلم کی روانی پر اس کی گرفت نہیں رہتی، رہ بھی نہیں سکتی۔ یہاں غیب سے مضامین خیال کی میں آنے لگتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسی بات کو اپنے خوبصورت انداز میں یوں پیش کیا ہے[1]؛

> خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی؛ اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

ایسے مکاتیب میں داخل اور خارج کا آپ ہی آپ اظہار ہو جاتا، اور مکتوب نگار کی شخصیت کسی ظاہرداری اور ملمع کے بغیر منظرِ عام پر آ جاتی ہے۔ اس نوع کے مکاتیب آئینہ خانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی لکھنے والا چاہے یا نہ چاہے، ان سے اس کی شخصیت منعکس ہو کے رہتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں تصانیف کو پیشے کا اور خطوط کو شخصیت کا ترجمان قرار دیا ہے۔ ایسے مکاتیب میں قلم سے کام نہیں چل سکتا؛ ایسے مکاتیب تو دل سے لکھے جاتے ہیں۔ ادب میں ایسے ہی مکاتیب کی اہمیت ہوتی ہے اور ایسے مکاتیب ہی فنونِ لطیفہ کے ذیل میں آتے ہیں۔

ادبی تذکرے، ادبی تواریخ، سوانح عمریاں اور خود نوشت سوانح عمریاں — یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے وسیلے سے ہم کسی فرد یا شخصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری کو اس خصوص میں اونچی حیثیت حاصل ہے، جس میں شخصیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ تاہم اس میں تصویر کے دونوں رُخوں کا ملنا محال ہے۔ یہاں بیشتر واقعات پردۂ خفا میں رکھے جا سکتے ہیں، مبالغہ آرائی بھی ممکن ہے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا بھی۔ اس ضمن میں تازہ اور عمدہ مثال جوش کی "یادوں کی برات" ہے۔ مکاتیب کا معاملہ ان سے مختلف ہی نہیں، ممتاز بھی ہے۔ خاص طور پر ان مکاتیب کا

۱۔ رشید احمد صدیقی، مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال، نگار، لکھنؤ، (جولائی ۱۹۴۰ء): ۱۹

جن کو میں نے فنون لطیفہ کی زمرے میں شامل کیا ہے۔

مصنف اپنے مضامین میں، مقرر اپنی تقاریر میں، اور ایک عام فرد اپنی گفتگو میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے معیاری یا سامع سے وہ کتنا ہی بے تکلف ہو اور اپنائیت کا اظہار کرے پھر بھی وہ اپنے دل کی بات نہیں کہتا، موقع و محل کو ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ کتاب نہ جانے کب، کہاں اور کتنے افراد کے زیر مطالعہ آتی ہے، جو مختلف مزاج، میلانات اور افکار کے حامل ہوتے ہیں۔ تقاریر میں مقرر کو مخاطبین کی کئی سطحوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ہر طرح وہ نہیں کہہ سکتا، جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ گفتگو میں مخاطب سے نسبتاً بےتکلفی ممکن ہے لیکن یہاں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پاس و لحاظ کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ مکاتیب کا معاملہ ان سب سے جداگانہ ہے، ایک حد تک برعکس بھی کہا جا سکتا ہے یہاں جھجک، تکلف، خاطرداری، پاس و لحاظ اور مروت کے پردے خود بخود اٹھ جاتے ہیں، یا اٹھا دیے جاتے ہیں، بالخصوص ایسے خطوط میں جو بےتکلف احباب کو تحریر کیے جاتے ہیں اور اسی لیے زیادہ برجستگی کے حامل ہوتے ہیں۔ اور کیا کہیے، ان میں انسان اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے، اپنے فکر و خیال کو برافگندہ نقاب کر دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض افراد اپنے نجی مکاتیب کی اشاعت مناسب خیال نہیں کرتے، خواہ وہ کتنی ہی ادبی حیثیت کے حامل ہوں اور ادبی جواہر پاروں کی حیثیت کیوں نہ رکھتے ہوں، کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں! رشید احمد صدیقی کا شمار انہی افراد میں ہوتا ہے، بلکہ ان کا رد عمل تو قدرے شدید ہے۔ اپنے اس موقف کی انھوں نے وضاحت بھی کر دی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے موسومہ اپنے مکتوب مورخہ ۱۶ جون ۱۹۶۳ء میں رقمطراز ہیں:

> نجی خطوط کے شائع نہ کرنے کے جواز میں دوستوں سے گفتگو اور بحث کے دوران میں مثال بجنسہ وہی دیتا تھا، جو آپ نے دی ہے، یعنی غسلخانے میں تانک جھانک کس صحیفۂ اخلاق میں روا ہے![1]

ایک موقع پر اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں[2]:

---

[2] - غالب کی شخصیت اور شاعری ص ۲۳

> مجھے خطوط نگاری کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بچپن میں انشائے ماہو دام، جوانی میں لیڈی چیٹرلی کے عاشق کے خطوط اور بڑھاپے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب نظر سے گزرے۔ ممکن ہے اس کا ردِ عمل ہو جس کی وجہ سے اس پر اصرار ہے کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں شائع نہ کیے جائیں۔

یہ تو باتیں تھیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ رشید صدیقی کے مکاتیب اچھے ہوتے ہیں بہت اچھے، بیحد اچھے۔ علمی، ادبی، تہذیبی، یہ اور ایسے ہر مفہوم میں اچھے۔ مکتوب کی پہچان رشید احمد صدیقی نے یہ بتائی ہے کہ اسے پڑھ کر تلف کر دیا جائے۔ رشید احمد صدیقی کی اس منطق کو کون تسلیم کریگا؟ اور اگر کچھ دیر کے لیے کوئی تسلیم کر بھی لے، تو کیا عجب کوئی دلجلا کہہ بیٹھے کہ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ گفت و شنید کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے!۔

ممکن ہے رشید احمد صدیقی نے اپنے مکاتیب کو تلف کر دیا ہو، لیکن کسی اور سے یہ ہرگز ممکن نہیں۔ یہ ادبی قتل کون کریگا! رشید صدیقی کے اس رجحان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ رشید صدیقی ایک جذباتی فنکار ہیں۔ وہ لوگوں سے عموماً لیے دیے رہتے ہیں اور ایک حد قائم رکھتے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن جن سے بےتکلف ہوتے ہیں، اُن پر اُن کی شخصیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے اُن کے راز، راز نہیں رہتے، اور پھر اپنے تعلق سے اور اُن کے بارے میں بھی بلا کسی تکلف کے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ مختلف شخصیات طنز و ظرافت کا نشانہ بنتی ہیں اور جہاں تہاں رازہائے درون پردہ بےنقاب ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کا بوجوہ اشاعت پانا مناسب نہیں ہوتا۔ وہ خود اپنے اس اصول پر شدت سے کارفرما ہیں۔ غالباً انھوں نے اس نوعیت کے خطوط تلف نہیں کیے، بلکہ واپس کر دیے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۵ جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک ایسے مکتوب کا حوالہ ملتا ہے:۔

> اس خط کو آپ ہی رکھ لیں۔ میں ایسے خطوط کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا جس میں لکھنے والے نے نجی باتیں لکھی ہوں اور اس کا امکان ہو کہ جس کو لکھا گیا ہے'

وہ کبھی اس سے اس طور پر فائدہ اٹھائے کہ لکھنے والے کو شرمساری ہو۔

لیکن جہاں تک خطوط کی وقعت، ادب میں ان کی اہمیت اور ان کے جزوِ فنونِ لطیفہ ہونے کا تعلق ہے، رشید صدیقی کا معیارِ مذاق بہت بلند ہے، مہذب اور شائستہ۔ وہ اچھے مکاتیب لکھتے ہی نہیں، اچھے مکاتیب کا احترام کرنا بھی جانتے ہیں۔ ان سطور سے مکاتیب کے بارے میں ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے:

> خطوط کو نہ تجارتی ہونا چاہیے، نہ فلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا تصنیف کرنے کا فن نہیں، جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا، گفتگو ہی کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایاں اور بیکراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے۔
>
> خطوط کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ مختلف فنونِ لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئیگا۔ غالب نے جو کہا ہے کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، یہ اسی رمز کی وضاحت ہے۔ ان امور کے پیشِ نظر غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ تصنیف اور مصنف میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں ان میں سے کئی خصوصیات ملتی ہیں۔ "کئی" اس لیے کہ غالب کے مکاتیب، غالب کی شخصیت، اسلوب اور انفرادیت کے مظہر ہیں، رشید صدیقی کے مکاتیب میں ان کی اپنی شخصیت، ان کا اپنا اسلوب اور ان کی اپنی انفرادیت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ممیز کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ غالب کی شخصیت اور شاعری : ۲۴

رشید صدیقی مکاتیب نگاری کے معاملے میں وسیع النظر اور فراخدل ہیں۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے کم و بیش ہر مکتوب کا جواب پابندی اور عجلت سے دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کے شوق کا مشغلہ ہے، اور ان کی بڑائی کی دلیل بھی۔ وہ ان معنوں میں "بڑے نہیں" کہ مکاتیب کا جواب نہ دے کر لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ آدمی مصروف اور "بڑا" ہے۔ اس سے قطعِ نظر اپنے قریبی احباب اور شاگردوں کو مکاتیب لکھنے میں وہ تموّد پہل کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی اپنے معدودے چند عزیز دستوں اور انتہائی عزیز شاگردوں کے علاوہ اوروں سے ملاقات کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ علیگڈھ میں جو لوگ رشید صدیقی کے مزاج کی اس کیفیت سے واقف ہیں، وہ بھی ان سے کم ہی ملتے ہیں۔ اب گویا طرفین میں ایک "سمجھوتہ" سا ہو گیا ہے، نہ رشید صدیقی اوروں سے ملتے ہیں اور نہ دیگر حضرات رشید صدیقی سے! اس چیز نے رشید صدیقی کے مکتوب نگاری کے "مشغلہ" کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ کسی سے کچھ کام ہو، کسی شعر کے بارے میں دریافت کرنا ہو، کسی کتاب کی ضرورت ہو، کسی مصنّف یا شاعر کے بارے میں معلومات درکار ہوں، کسی کا مضمون پسند آ جائے، کسی کے مضمون میں کسی نکتے سے اختلاف ہو، کسی اطلاع پر تبصرہ کرنا ہو، علیگڈھ کے کسی واقعہ پر اظہارِ خیال مقصود ہو، کسی پر ناراضگی کا اظہار کرنا ہو، کسی کو مبارکباد دینی ہو — غرض یہ یا ایسی کوئی بات ہو، رشید صدیقی کسی سے ملتے ملاتے تو ہیں نہیں، پہلے سے کہیں زیادہ اب —— بس ایک رقعہ لکھ دینگے۔ یہی نیم ملاقات ان کے لیے ملاقات ہے، بلکہ ملاقات سے بھی زیادہ! ادھر یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد گزشتہ کئی سال سے انھوں نے ملنا جلنا اور کم کر دیا ہے، اپنی ضعیفی، مزاج کی ناسازی، خانگی حالات اور علیگڈھ کے واقعات نے انھیں اور زیادہ تنہائی پسند اور گوشہ نشین بنا دیا ہے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے۔ راقم الحروف کے نام خط ۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

علالت کی معذوریوں نے علیگڈھ سے باہر نہیں جاتا، بلکہ گھر سے باہر

نکلنے کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔

اس طرح ان کے خطوط کی تعداد افزوں ہوتی جا رہی ہے، جو اُن کی تنہائی پسندی اور گوشہ نشینی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یوں وہ اپنی انجمنِ خیال کو زندگی حرارت اور روشنی دیتے رہتے ہیں۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں ان کی شخصیت اور اسلوب ہی نہیں، ان کا طرزِ فکر، ادبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات و مسائل کے بارے میں اُن کا رویہ اور مختلف شخصیات کے متعلق ان کے خیالات کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔ رشید صدیقی کی شخصیت نہ پیچدار ہے اور نہ تہ در تہ۔ کسی رمز و ایما کے بغیر وہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے اور ان کے خطوط میں بھی۔ وہ باتیں جو انھوں نے اپنے مضامین میں نہیں بیان کی ہیں، اپنے مکاتیب میں پیش کر دی ہیں۔ اس طرح ان کے مکاتیب اُن کے ذہن کے ان گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو اُن کے مضامین میں روشن نہیں ہو سکے ہیں۔ اگر آپ نے رشید صدیقی سے ملاقات کی ہے ان سے تبادلۂ خیال کیا ہے، انھیں دیکھا ہی نہیں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سمجھا ہے، تو آپ انھیں اپنے مکاتیب میں بولتا پائیں گے۔ یہ ان کے مکاتیب کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اور پھر اُن کے اسلوب کی ظرافت، شائستگی، شگفتگی، بات کو دھیمے دھیمے کہنے کا انداز۔ خنکی اور کیف میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ! لگتا ہے، ریکارڈ ہیں جو آپ سے آپ بجتے جا رہے ہیں۔

رشید صدیقی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں۔ وہ سیاسی آدمی ہیں ہی نہیں، ملک کے عام انتخابات میں انھوں نے شاید ہی کبھی اپنے ووٹ کا استعمال کیا ہو۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سیاسی مسائل اور سیاستدانوں پر کاری طنز ضرور کیے ہیں۔ لیکن کسی سیاسی مسئلے پر اظہارِ خیال نہیں کیا۔ البتہ مکاتیب میں کہیں کہیں سیاسی مسائل پر خیالات کا اظہار ملتا ہے، بہت سنجیدگی کے ساتھ، بہت محتاط ہو کر۔ ان کے سیاسی طرزِ فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے غیر معمولی وسیع انداز اختیار کیا ہے۔ قومی ہی نہیں، بین قومی موضوعات پر بھی۔ ادھر ہند و پاکستان کے مابین طے پانے والے شملہ سمجھوتے پر پروفیسر مسعود حسین خان (وائس چانسلر

جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے نام خط مورخہ ۴ جولائی ۱۹۷۲ء میں لکھتے ہیں،

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حال میں جو مفاہمت ہوئی ہے، کاش اب سے بہت پہلے ہوئی ہوتی۔ کتنی خواریوں، ہلاکتوں، محرومیوں سے نجات ملتی۔ کتنی عقل انسانی سے اور کتنا جلد ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور کیسے کیسے دردناک تاوان لینے کے بعد واپس آتی ہے!۔

خیر یہ تو ایک انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر تھا۔ مسعود صاحب ہی کے نام ایک اور مکتوب مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں روس میں کمیونزم کی انسانی کشمکش کے بارے میں لکھتے ہیں:

روس کی حالیہ اکھاڑ پچھاڑ کے مقابلے میں آپ نے جو مثال (حال ہی کی) انگلستان کی دی، اس سے کتنی باتیں تازہ ہو گئیں، جن کو یادوں کے کباڑ خانے میں پھینک چکا تھا۔ گزشتہ نصف صدی میں کمیونزم (نجاتِ موعودہ!) کے نام سے کیا کیا نہ ہوا، کون نہیں جانتا لیکن بقول فانی "بہلا نہ دل، نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی!" اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ آج جہاں آفاق پُر از فتنہ و شر ہی جہنم کا جو سماں نظر آ رہا ہے، کیا عجب، اگر اس کا بڑا سبب وہ عمل در ردِّ عمل ہو، جو روس کا لایا ہوا ہے۔ اقدار کی یکسر اور یک بیک جو شکست و ریخت روس میں ہوئی تھی، اس سے ساری دنیا کے اخلاقی بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ معاشرے میں بدچلنی اور بدامنی کی کیسی قیامت برپا ہے۔ روس ایک طرح کا پریشر پلٹ بن گیا ہے، جس کی وجہ سے سارا فضائی نظام درہم برہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بدبخت حکومت اور کیسی مظلوم قوم ہے، جہاں دوست یا عزیز پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قہرِ الٰہی اور کسے کہتے ہیں!

علیگڑھ تو رشید احمد صدیقی کی زندگی ہے وہ اُن کے لیے سب کچھ۔ اُن کے بیشتر مضامین کا مرکز و محور یہی ہے۔ اسی طرح علیگڈھ کا ادبی نام ہے رشید احمد صدیقی! رشید احمد صدیقی نے ہمیشہ علی گڈھ کا ذکر بڑے چاؤ سے، بڑے اہتمام سے، بڑی اپنائیت سے

کیا ہے۔ علیگڈھ کے بنیادی کردار کو تبدیل کرنے کی بات ہو، یا علیگڈھ کو کسی نہ کسی بہلانے بہکانے کی۔ یہ سب باتیں رشید احمد صدیقی کے لیے سوہان روح ہیں۔ اپنے مضامین و مقالات میں انھوں نے علیگڈھ کی تہذیبی، علمی اور ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے، لیکن علیگڈھ کے اس رُخ پر انھوں نے اظہار رائے نہیں کیا ہے، شاید کرنا ہی نہیں چاہتے ہوں کہ وہ طبعاً اپنے دل کے داغوں کی نمائش عام طور پر پسند نہیں کرتے۔ ہاں جب بھی انھوں نے اپنے ہمخیال اور ہم مذاق افراد کو مکاتیب لکھے ہیں، علی گڈھ کے بارے میں ان کا خامہ خونچکاں بن گیا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی شدت پر قابو نہیں رکھ سکے ہیں۔ اور اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ علیگڈھ میں اپریل ۱۹۶۵ء میں جو ہنگامہ ہوا، اس کے لیے ذمہ دار کون تھے، یہ کیوں ہوا وغیرہ سے بحث نہیں . . . . ان ہنگاموں کے ایک مہینا بعد ۲۴ مئی ۱۹۶۵ء کو علیگڈھ کا یہ عاشقِ زار مسعود حسین خان کو لکھتا ہے۔ دیکھیے، زخم دل کتنے تازہ ہیں، کتنے ہرے!

"علیگڈھ کے حادثہ کو آج ایک ماہ ہونے کو آیا، لیکن اُس کا اثر کچھ اس طرح کا ہے جیسے وہ سانحہ گزر نہ چکا ہو، بلکہ بعنوان دگر برابر پیش آ رہا ہو۔ معلوم نہیں، اب اپنی زندگی میں اس کا ختم ہونا دیکھ پاؤنگا، یا نہیں۔"

اور یوں کئی سال گزر جاتے ہیں ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی (ترمیم) مسودہ قانون پارلیمان میں پیش ہوتا ہے۔

انھیں کے نام ایک اور مکتوب، ۶ جون ۱۹۷۲ء کے تحریر کردہ میں، اس مسودۂ قانون کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:-

"حادثہ سخت ہو یا جانِ عزیز، رعایت لفظی ہم اور آپ سے نہ چھوٹیگی۔ مسعود صاحب! ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہونگا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں، یا ہم کو رکھنا چاہیے، اس کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آسکتے۔ فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی مرد مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے کی جا رہی ہے، ہارنے جیتنے کے لیے نہیں۔ اسی لیے اس کا انجام یا انعام شہادت یا سعادت

ہے جس کے لیے زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں، اس کے لیے مرنے میں
کیا ہرج ہے؟

اسی طرح کے مکاتیب سے رشید احمد صدیقی کی علیگڈھ سے وابستگی پر کچھ تیز روشنی پڑتی ہے کہ وہ اس کی گلی میں جانے کے لیے جان و دل کو عزیز نہیں رکھتے۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں انہی موضوعات پر نہیں، گھریلو معاملات پر بھی اظہارِ خیال ہے۔ نجی معاملات پر "گفتگو" بھی ہوتی ہے، اپنی صحت اور دوسروں کی عافیت کی باتیں بھی۔ غرض وہ سب کچھ جو ایک عام انسان سے ممکن ہے؛ اور فنکار خواہ وہ کتنا ہی عظیم المرتبت اور عالی مقام کیوں نہ ہو، اپنے اندر کے انسان سے تو جدا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ممکن بھی نہیں۔ بیگم رشید صدیقی، حیدرآباد کے نقشی پاندان کی خواہاں ہیں۔ اس کے بارے میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو مسعود صاحب کو رقمطراز ہیں:

"معلوم نہیں، میرا وہ خط آپ کو ملا یا نہیں، جس میں بیگم فاطمہ عالم علی صاحب (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحبزادی) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میری بیوی نے ان کو ایک عدد حیدرآبادی پاندان خریدنے کے لیے پچپن روپے دیے تھے، جب وہ اوائل ماہ گزشتہ میں کشمیر جاتی ہوئی علیگڈھ ٹھہر گئی تھیں۔ تاباں صاحب کے صاحبزادے میاں افتخار حیدرآباد پہنچے ہوں گے، ان کی معرفت وہ پاندان (بغیر ناگردان کے) بھیج دیا جائے، یا بیگم مسعود وہ روپے لے کر خود ویسا ہی پاندان خرید کر بھجوا دیں، جیسا موصوفہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ بیگم فاطمہ کا پتہ نہیں معلوم، ورنہ ان کو راست لکھتا۔"

اسی طرح ایک اور خط میں سوئیوں کا تذکرہ ہے۔ یہ خط ان کے بہنوئی جناب محمد سمیع صدیقی (استاد ندوہ کالج) کے نام ہے، ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کا لکھا ہوا:

شاہدہ سلمہا یا رقیہ سلمہا علیگڈھ آنے لگیں، تو ان کے ساتھ دو کلو لکھنؤ کی سوئیاں

> بھیج دینا۔ بنارس کی بہت باریک سوئیاں ہرگز نہ ہوں۔ صرف لکھنؤ
> کی، دو کیلو ہوں اور حالات بدستور ہیں۔
> نیاز بنارس کی بھیج دیا کرتے تھے، وہ اب مقبول نہیں ہیں۔ صرف لکھنؤ
> کی کام میں لائی جاتی ہیں۔

سمیع صدیقی صاحب ہی کے موسومہ مکاتیب میں کہیں اصغر علی محمد علی کے عطر کی فرمائش ہے، تو کہیں محمد عمر محمد صدیق کے الا کے برقی قوام کی۔

رشید صدیقی کو گلابوں کا بہت شوق رہا ہے۔ ان کے گھر میں گلاب کا ایک باغ تھا، جس میں دیسی گلاب، ولایتی گلاب، رنگ رنگ کے گلاب، چھوٹے گلاب، بڑے گلاب، غرض طرح طرح کے، قسم قسم کے گلاب ـــــ لیکن یہ شوق بتدریج کم ہو گیا، عمر کے ساتھ ساتھ۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آ گیا کہ انھوں نے گلابوں کا یہ شوق اپنے بھانجے ڈاکٹر کمال الدین کے حوالے کر دیا۔ مسعود صاحب کے موسومہ مکتوب مورخہ ۹ اگست ۱۹۷۶ء میں لکھتے ہیں:

> ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے
> کا شوق تھا۔ کراکری چوری ہو گئی۔ گلابوں کا شوق کمال کو منتقل ہو گیا۔
> قالین کے بجائے اب چٹائیاں سمیٹنے لگا ہوں۔ خانہ آرائی کے لیے کیا
> دیدۂ یعقوب کی سپیدی اور کیا جلوۂ ماہِ کنعاں!

رشید صاحب کی صحت نے کبھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بالعموم بیمار رہے، اور بیماری نے اپنے لیے کوئی نہ کوئی حیلہ تلاش کر ہی لیا۔ برسوں سے وہ ایک گردے کے بغیر تو زندگی گزار ہی رہے تھے؛ اب ادھر چند سال سے دو چار اور عوارض کا مستقل شکار ہو گئے ہیں۔ ان میں ضعیف العمری سب سے بڑا عارضہ ہے۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ مجبوری بڑی شے ہے۔ بُری شے ہے۔ وہ سب کچھ سہتے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی علالت کا تذکرہ مختلف اصحاب کے نام مکاتیب میں کیا ہے۔ اب جب کہ عوارض ان کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں، یہ ذرا ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری

(صدر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی) کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء میں اپنی حالت بیان کرتے ہیں:۔

> ادھر کچھ طبیعت اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ ایسے میں معالج کی ہدایت کے مطابق ایک آدھ tranquillizer لے کر دم بخود ہو جاتا ہوں۔ چارپائی پر لیٹے رہنے کا یہ بدل نکالا ہے۔ آپ کل شام تشریف لائے، تو میں اسی عالم میں تھا۔

اور ۲ جولائی ۱۹۷۱ء کا یہ خط راقم الحروف کے نام اپنی معذوریوں کا بیان کرتے ہیں:

> "میری طبیعت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے یہ چند سطر لکھ رہا ہوں...
> ..... نہ آنکھ کام دیتی ہے، نہ ذہن، یا دل۔ دل کا پرانا مریض ہوں اور آنکھوں میں موتیا بند۔.."

آئے دن ان کے عوارض میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آج جو عارضہ نہیں تھا، کل اس سے دو چار ہیں۔ ایک اور مکتوب ہے، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام، ۷ جنوری ۱۹۷۳ء کا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ خود اپنی صحت کے بارے میں کس قدر بے اطمینانی کا شکار ہیں:۔

> آپ کو شاید نہ معلوم ہو کہ جہاں مجھے اور بہت سے آزار لاحق ہیں، ان میں سال بھر سے ہرنیا کا اضافہ ہو گیا ہے، جس سے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے یا کوئی چیز اٹھانے میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔ ہرنیا کا علاج صرف آپریشن ہے، جو مجھ جیسے قلب کے مریض اور معمّر کے لیے ناممکن ہے۔ دن میں کئی بار اس میں سخت درد ہوتا ہے، اور بے سان و گمان۔ اور اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے۔

رشید صدیقی، اپنے جاننے والوں، شناساؤں اور دوستوں سے کس قدر تعلق خاطر رکھتے ہیں، اس کا اظہار "گنجہائے گرانمایہ"، "ہم نفسانِ رفتہ" اور "ذاکر صاحب" کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

ان مرقعوں میں جو اُردو ادب کی متاعِ گرانمایہ ہیں، رشید صدیقی نے اپنے احساسات اور جذبات کی صحیح تصویر پیش کردی ہے۔ آپ پڑھ لیجیے، وہ کتنے لطیف اور کتنے گہرے جذبات رکھتے ہیں یہ ان کا صرف مرقع نگاری کا انداز و اسلوب ہی نہیں، ان کا اپنا مزاج بھی ہے۔ یہ ایک فنکار ہی کے نہیں، ایک انسان کے بھی احساسات ہیں۔ رشید صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا مُرقّع بھی لکھا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کے بارے میں دو، تین جملے ہیں، لیکن اس اجمال میں کتنی تفصیل ہے! یہ جوئے کم آب، بحرِ بیکراں سے کم نہیں۔ الفاظ کا انتخاب، ان کی نشست اور جملوں کا دروبست ہے ہی ایسا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت سے اس وقت یونیورسٹی میں سبھی نہایت افسردہ خاطر ہو رہے ہیں۔ کتنا بڑا آدمی ہم سے رخصت ہو گیا۔ ایسے ہمہ جہت، فاضل اور یگانۂ روزگار کو اب ہم کہاں پائیں گے!"

اور بعض اصحاب ایسے بھی ہیں، جن کا انھوں نے مرقع نہیں لکھا، لیکن ان کے بارے میں مرقع نگاری کر گئے ہیں کہ متعلقہ شخصیت اپنے حقیقی خد و خال میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی ہی شخصیت مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر عمرالدین کی تھی۔ ان کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مکتوب ہے ۱۴ اگست ۶۴ء کا تحریر کردہ۔ یہ بھی مسعود صاحب کے نام ہے:-

"عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے میری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور "احسان" کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ، ہنستا بولتا، محبت کرتا ہوا، دیکھتا چلا آیا، اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔"

رشید صدیقی کا ادب کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ وہ فن اور فنکار

کے لیے سب سے پہلے اخلاق وآداب، حیا، شرافت اور تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ ان کے اس موقف سے تھوڑا بہت اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس خیال کی صداقت اور خلوص سے کسی کو شاید ہی انکار ہو کہ کوئی شخص اسی وقت اچھا فنکار بن سکتا ہے، جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو۔ یہاں اچھے انسان سے مراد اخلاق وآداب، حیا، شرافت اور تہذیبی اقدار کا حامل انسان ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے بعض مکاتیب میں بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو ۱۶ جون ۱۹۶۲ء کو تحریر کرتے ہیں:۔

> شعر ہو، ادب ہو، زندگی ہو، فن ہو، سب لا طائل، اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ بےحیائی دبے غیرتی فن نہیں، معصیت ہے۔ البتہ اس کا علاج نہیں، اگر کوئی یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ معصیت ہی اصل فن ہے، یا معصیت اپنے ظہور کے لیے فن کی تلاش میں رہتی ہے۔

ان سطور کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ فنکار کو کسی نظامِ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ لیکن رشید صدیقی اس سے قطع نظر فنکار کے لیے کسی نظامِ حکومت کی پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ یہاں فنکار کی آزادی پر زور دیتے ہیں، جس کے بارے میں کئی ایک نے آواز بلند کی ہے۔ ان کے مضامین میں جہاں تہاں فنکار کی آزادی کی بات ملتی ہے۔ لیکن مکاتیب میں بھی انھوں نے اس تعلق سے اپنے خیالات کو جامع لیکن مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے نام مکتوب مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں۔

> ...... آرٹسٹ کو خود اظہار کی پوری آزادی ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے زندگی میں وہ تنوع اور توانائی نہیں آتی، جس کے طفیل ...... ہر دم جواں ہے زندگی ......

لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے آزادی کے حدود بھی متعین کر دیے ہیں۔ ان کی آزادی کچھ حدود اصول اور ضوابط کا حامل ہے، بے ضابطہ اور بے لگام نہیں۔ ایسی آزادی

کے بارے میں ان کے خیالات سنیئے۔ مذکورہ مکتوب ہی کا اقتباس ہے:

> ..... بے ضابطہ اور بے لگام آزادی افراد کی ہو یا جماعت کی، قابلِ قبول نہیں، اس لیے کہ یہ نظم نہیں بلکہ "مزاج" ہو گی۔ ہر شخص یا آرٹسٹ کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے Artistic Urge کا اظہار کرے۔ لیکن یہ تو سماج یا اس کے مستند افراد ہی طے کرینگے کہ اس آرٹسٹ کی طرف کیا اور کتنا التفات کیا جائے .....

رشید صدیقی کے ہاں فن اور لوازمِ فن کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ بہت زیادہ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۸ء میں تحریر کرتے ہیں:

> مصنف یا تحریک سے بیزار ہونے میں مضائقہ نہیں۔ البتہ فن کے آداب اور تقاضوں سے منحرف ہونا کسی طرح گوارا نہ کرنا چاہیئے۔

رشید صدیقی نے تنقید کی سمت توجہ ضرور دی ہے، لیکن ان کا تنقیدی سرمایہ کمیت کے اعتبار سے زیادہ نہیں۔ اُن کی تنقید تاثراتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس پر ان کا اسلوب! قاری کو ان کی روحِ تنقید پر توجہ دینے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے! وہ ان کے اسلوب کے سحر سے مسحور ہو جاتا ہے۔ مکاتیب میں انھوں نے مختلف شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں اپنے آرا ظاہر کیے ہیں۔ یہاں اسلوب کی رو نسبتاً دھیمی ہے، اس لیے تنقید کے خد و خال بھی نسبتاً واضح ہیں۔ ایسے ہی مکاتیب سے ان کے تنقیدی شعور پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے تنقیدی موقف کو متعین کرنا ہو تو اُن کے ایسے مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس خصوص میں، میں ان کے دو مکاتیب کے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ اتفاق سے یہ دونوں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے نام ہیں۔ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء کے مکتوب میں اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اسرار اور رموز کو آپ نے کم اہمیت دی ہے۔ میرے نزدیک اقبال کی شاعری

نہیں، تو اقبال کے عرفان حقیقت میں یہ کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرے شعراء سے ہٹ کر اور ان سے بلند ہو کر اقبال نے اپنے ایمان و ایقان کا ان میں اظہار و اعلان کیا ہے۔ اس طور پر ان کی شاعری کا ان دو لائینوں کو context یا سیاق و سباق کہنا چاہیے۔ ایسے موقع پر یا اس منزل کی شاعری کو glory glamour سے نہیں دیکھتے، شاعر کی شخصیت سے پرکھتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے، جو اس قول کی نفی کرتی ہے، یا اس سے علٰحدہ ہو جاتی ہے جو کلام پاک میں ملتی ہے کہ شعرا بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے وہ آیت ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔

اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ اقبال نے بعض نظمیں وقتی قدر و قیمت کی لکھی ہیں، جس کو جرنلزم کی اصطلاح میں news reviews کہتے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک محسوس کیا ہے کہ اقبال نے، جن مسائل پر جو بات، جس بلاغت اور خوبصورتی سے کہہ دی ہے، غالباً سعدی کے بعد اب تک کسی نے نہیں کہی ہے۔ صوفیوں کی زبان میں یہ جُز میں کُل دیکھنا ہے، یا جُز سے کُل کا استنباط ہو۔ "ارمغان حجاز" کا ایک خاص context میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ اقبال عاشقِ رسول تھے، عہدِ رسالت کے عاشقِ رسول کی مانند۔ وہ کبھی دیارِ رحمت میں نہیں پہنچ سکے۔ "ارمغانِ حجاز" میں انھوں نے اُن کی حد تک، اس کی یوں تلافی کی ہے کہ عالمِ خیال میں سفر اختیار کیا ہے اور اپنے ذوق و شوق کا عالم بے اختیاری و بیخودی میں اظہار کیا ہے۔

یہ اقتباس قدرے طویل تھا؛ دوسرا مختصر ہے، لیکن بایں طور اہم کہ وہ کلاسکس کے مقام کو تسلیم کرتے ہوئے، ادب کو زندگی سے کس طرح ہمکنار و ہم آہنگ کرتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مکتوب ۲۵ نومبر ۱۹۷۰ء کا ہے:

غالب، حالی اور اقبال کو سمجھے بغیر اُردو کے شعراء و تنقید نگار، خاص طور پر نوجوان طالب علم، اپنے اسلاف کی عظیم خدمات کا صحیح احساس نہیں کر

کرسکتے۔ آشوب و آزمائش کے موجودہ دور میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔

طنز و مزاح رشید احمد صدیقی کا اہم میدان ہے۔ مکاتیب میں یہ جوہر کیوں نہ کھلتے! یہاں یہ جوہر کھلے ضرور ہیں لیکن کم کم۔ ان کے مکاتیب عموماً طنز و مزاح سے دور ہوتے ہیں، بلکہ وہ خوش مذاقی کے دائرے میں بھی نہیں آتے، جو غالب کے مکاتیب کا طرۂ امتیاز ہے؛ اور اگر ہے بھی، تو غالب سے اس کا مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ حال آنکہ مزاح نگار ہونے کی وجہ سے اُن کے مکاتیب میں یہ چیز زیادہ پائی جانی چاہیے تھی۔ ان کے مکاتیب کی فضا علمی و ادبی ہوتی ہے، متانت و سنجیدگی کی حامل۔ البتہ یہی سنجیدگی کہیں کہیں شوخ سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بس۔ بڑی بلاغت اور سنجید لطافت کے ساتھ! مزاح کی یہ ہلکی سی لہر ملاحظہ ہو۔ مسعود صاحب کو ۸ جون ۱۹۷۱ء کو لکھتے ہیں:

> کیا معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ لیکن اس کی خوشی ہے کہ میرے
> دعا مانگنے سے پہلے آپ صحتیاب ہو گئے، خدا نے میری دعا کو anticipate
> کرکے آپ کو صحتیاب کر دیا ہو!
>
> کیا ایسے برگزیدہ یا بر خود غلط بندے نہ ہوتے ہونگے!

اس خط میں شوخی کی بس ایک زیریں سی لہر ملتی ہے۔ جب کہ ایک اور مکتوب میں یہ لہر واضح ہے، خدائے پاک پر بھی "طنز" ہے اور عورت پر بھی۔ ان دو پر طنز ہو اور مکتوب ہو مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام، تو ایسے مکتوب کی اہمیت دو بالا ہو جاتی ہے۔ مکتوب ۱۷ دسمبر ۱۹۶۰ء کا ہے:

> ایسے معمول Investment پر اتنا زیادہ Dividend
> ایسے کاروبار کو کیا کہا جائے۔ مثلاً
>
> اللہ دے اور بندہ لے۔
>
> یہ فقرہ مثل کے اعتبار سے جتنا غلط استعمال کر رہا ہوں، امر واقع کے اعتبار

سے اتنا ہی صحیح ہے۔ فقرے کے تیور سے معلوم ہوتا ہے، کسی عورت نے تصنیف کیا ہے۔ اس طرح کی ملی جلی طنز و تجید وہی کر سکتی تھی۔ کیا معلوم، ہماری طرح اللہ میاں بھی عورت کی اور باتوں کو enjoy، ورنہ اگنور کرتے ہوں۔

ناوک نے تیرے صید۔ ۔ ۔ ۔

اور یہ مکتوب ہے تحریر کردہ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۶۲ء کا پروفیسر محمد حسن کے نام اس میں فرقہ وارانہ تعلقات پر طنز ہے، کتنا کاری، کتنا بھاری:

عید کا چوتھا دن مبارک ہو۔ دیر سویر کا خیال نہ کیجیے گا۔ مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا، جو تیوہار خیریت سے گزر جائے، مسلمانوں پر اس کا شکرانہ دوسرے تیوہار تک واجب رہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ (اسی مکتوب میں اس کے علاوہ)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بتایا گیا کہ آپ کئی بار تشریف لائے، لیکن میں مکان پر موجود نہ ملا۔ آئندہ کے لیے دعا ہے، غالب سے معذرت کے ساتھ۔

آئے وہ یوں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں

معذرت اس لیے کہ میں نے مصرع موزوں پڑھا یا لکھا ہے، لیکن ناموزوں موقع پر!

رشید صدیقی کسی زمانے میں پان بہت کھاتے تھے، اب نہیں۔ اُردو شاعری کا ذوق ان کو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن کسی یونیورسٹی کے رجسٹرار کے بارے میں جو پان اور اردو شاعری سے برابر کا شوق رکھتے تھے، کتنا شوخ طنز کر جاتے ہیں۔ مکتوب ہے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء کا، پروفیسر محمد حسن ہی کے نام:

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر وہاں وہی رجسٹرار ہیں، جو بہت پان کھاتے تھے اور اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، جن کے تصرف سے صرف باتونی ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں کہیں ایسا آدمی دیکھیے، یقین کیجیے کہ نکما، ورنہ ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انفلوئنزا کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ مفتہ عشرہ ، جس طرف ، جس کو دیکھیے ، انفلوئنزا کا شکار دکھائی دیتا ہے ۔ غالب صدی کے دوران بھی ہر کس و ناکس ، ہر کہ و مہ ، غالب کا پرستار ، شیدائی ، بلکہ ماہر غالبیات بن چکا تھا ۔ یہ سال گزرا کہ بس وہی کیفیت ، جو پہلے تھی ۔ رشید صدیقی کس خوبی سے بات میں بات پیدا کرتے ہیں ۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ، صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کو ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء کو لکھتے ہیں :

> . . . . . ان دنوں میں بھی غالب فلو میں مبتلا ہوں ۔ نظام لیکچرس کا یہی موضوع ہے ۔ ریڈیو پر اسی موضوع پر تقریر کرنی ہے اور غالب مشاعرہ کا افتتاح بھی میرے سپرد ہے . . . . . .

مکاتیبِ غالب ، اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاید ان کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے ۔ رشید صدیقی کے مکاتیب بھی کئی خوبیوں کے حامل ہیں ۔ ان میں طنز و مزاح بھی ہے ہلکا پھلکا ، لیکن لطافت و بلاغت لیے ہوئے ۔ البتہ مکاتیبِ غالب کی طرح ان میں بےتکلفی نہیں ہے ۔ بہ یہی انداز بھی نہیں ، جو مکاتیبِ غالب کی ایک شان ہے ۔ ان کے ہاں رکھ رکھاؤ ہے ، پاس و لحاظ ہے ، لیکن مصنوعی اور بناوٹی نہیں ۔ یہ رشید صدیقی کی شخصیت کا ایک رخ ہے ، وہ رخ جو ان کے مضامین "گنجہائے گرانمایہ" اور ایسے ہی انشائیوں اور مرقعوں میں نکھرتا اور روشنی پھیلاتا چلا گیا ہے ۔ رشید صدیقی کے مکاتیب میں ادبی چاشنی ہوتی ہے ، شگفتگی بھی ، تروتازگی اور شادابی بھی . . . . . ایک بانکپن ، طرحداری اور اسلوب کی دلآویزی بھی ۔ میں اسلوب کی وضاحت کے لیے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں ، یہی کافی ہوگا ۔ مسعود صاحب کو ۱۱ اپریل ۱۹۶۴ء کو تحریر کرتے ہیں :

> سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ لگا دی ہو ۔ آپ جانتے ہیں ، گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے ، کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے ، اور اس سے کیسا تاریک اور دم گھٹنے والا دھواں اٹھتا رہتا ہے ۔

اسلوب کی دلآویزی اور دلکشی کے ساتھ یہ اقتباس بھی دیکھیے۔ ایک جواہر پارہ ہے کہ جس کو ہمارے کلاسیکی ادب کے انتخابات میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب (معتمد عمومی انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش) کے موسومہ مکتوب میں لکھتے ہیں۔ (اس مکتوب پر تاریخ ندارد ہے، لیکن علیگڈھ کے پوسٹ آفس کی مُہر ۲۰ اپریل ۱۹۶۴ء کی ہے)

> جس کے سامنے کوئی اچھا اور بڑا مقصد ہوتا ہے، وہ زندگی اور زمانے کے معذرات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جب کہ ہر طرف غیر یقینی اور مایوسی پھیلی ہوئی ہو کسی اچھے اور بڑے کام میں لگ جانا قابلِ تعریف بات ہے۔ میں اس کو فتح کا پہلا زینہ سمجھتا ہوں۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں اس نوع کے کئی اقتباسات ملینگے۔ زندگی کا کونسا مسئلہ، کونسا رُخ یا کونسا پہلو ہے، جس کو انھوں نے نظر انداز کر دیا ہو۔ ان خطوط میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور جہاں تہاں ان کے لہجے میں دلسوزی، آزردگی اور غمگینی بھی آگئی ہے۔ انھوں نے خوشیاں بھی سمیٹی ہیں، اور زندگی اور زمانے کا رونا بھی رویا ہے۔ خیالات کے اظہار میں جرأت سے بھی کام لیا ہے اور کبھی مصلحتوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے مکاتیب کے مطالعے سے ان کے ذہن کی مختلف تہوں کا پتا چلتا ہے۔ ان کے مضامین سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے ہیں، لیکن ان کی مکمل شخصیت سے آگاہی کے لیے ان کے مکاتیب کا ہمہ گیر جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ ان کے خیالات کی تصویر، اُن کے ذہن و فکر تک رسائی حاصل کرنے کا ایک اہم پل، اور اُن کے معتقدات کا آئینہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مکاتیب میں الشان کا قلم نہیں، دل بولتا ہے، تو یہ بات رشید صدیقی کے مکاتیب پر حرف بحرف صادق آتی ہے کہ ان کے مکاتیب میں ان کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔

گفتار

مرتبہ: گیان چند

نگارشاتِ رشید میں اخلاقیات

۱۔ اخلاق:۔

مستند تعریف وہ ہے، جو دوسرے ہماری کریں، نہ یہ کہ ہم خود اس بارے میں زحمت گوارا فرمایا کریں۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۰)

ظاہر ہے خودستائی اور خودنمائی اس شخص یا جماعت کا شیوہ ہوتا ہے، جسے اس عیب کے سوا کسی ہنر کا سہارا نصیب نہیں ہوتا۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۱)

مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعدادوں کو پورے طور پر اور آخر تک بروئے کار لا سکے، خواہ وہ استعداد معمولی ہو، یا غیر معمولی۔ اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے، خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ (مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۸۲)

کام کرنا وہ نشہ ہے، جس میں نہایت آسانی سے ہر طرح کے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں۔ (مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۸۲)

بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر پر غالب آتی ہے (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۰۶)

سچائی بہت سہل اور سادہ ہوتی ہے۔ ایسی نہ ہوتی، تو ہر شخص کو بتایا کیسے جا سکتا اور وہ سمجھ کیونکر پاتا کہ سچائی کتنی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اس کی تلاش و تصدیق اتنی ہی مشکل ہے۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۸۶)

جسمانی یا فطری نقائص، یا معائب کی مذمت نامردی ہے (طنزیات و مضحکات: ۲۷)

آباؤ اجداد کی فروگزاشت پر اولاد کو موردِ لعن وطعن قرار دینا ناجائز ہے
(ایضاً: ۲۷)

زندگی کو یکسر فراغت، عشرت اور بےہنری کا گہوارہ بنا دینے اور رکھنے سے شدید ردِّ عمل کا سامنا ہوتا ہے۔ (عزیزانِ علیگڈھ (مشمولہ فکر ونظر): جلد ۱۲ شمارہ ۱۔۲۔۳ ۱۹۷۲ء)

انسان نے ابتدا سے آج تک جو ترقی کی ہے اس میں اس کے وجود کے حیوانی تقاضوں اور اخلاقی و روحانی صلاحیتوں میں مسلسل جدال یا سازش جاری ہوتی رہی ہے۔ یہ عمل تایوم الآخر قائم رہیگا۔ اس میں بحیثیت مجموعی واضح طور پر خیر کو شر یا انسان کو جانور پر غلبہ رہا ہے۔ (عزیزانِ علیگڈھ (فکر و نظر): ۱۶۴)

ہم جتنی فکر و فرزانگی اور دولت و اقتدار غلط کو صحیح بتانے اور منوانے پر صرف کرتے ہیں، اس کا عشر عشیر بھی صحیح کو صحیح بتانے اور منوانے پر صرف نہیں کرتے
(ایضاً: ۱۶۵)

۲۔ اخلاقی اقدار:

جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدے، ارادے، مقصد یا شخصیت کا احترام اور اس سے بےلوث شغف نہ ہوگا، نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہینگے، نہ کسی دوسرے کے لیے۔ (مضامینِ رشید (سرگزشتِ عہدِ گل): ۱۹)

امن، آسودگی، عالی ہمتی اور راست بازی کا وہ احساس یا اہمیت باقی نہیں رہی، جن کے بغیر زندگی کا کوئی معیار متعین ہوتا ہے، نہ موقف
(عزیزانِ علیگڈھ، (فکر و نظر): ۱۴۱)

۳۔ دیرینہ اقدار و روایات:

(اسکول میں طلبہ کے پاس آنے والے بزرگ) قدیم تہذیب اور وضعداری کا نمونہ

ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شغف سے، اس دلچسپ انداز سے سناتے اور اخلاق و تہذیب کے حدود میں رہنے کی نصیحت اس پیرایے میں کرتے کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا (آشفتہ بیانی میری؛ ۹)

(جو بنو ہیں عوام و خواص) کرتے کچھ ہوں، بیٹھتے سب کے سب برابر تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا! (آشفتہ بیانی میری: ۱۲)

کلاسکس کی گرانمایگی سے ذوق و ظرف کو جو وزن و وقار اور زندگی کو جو آب و تاب یا خوبی و خوبصورتی ملتی رہتی تھی، اس سے ہمارے نوجوان محروم ہو گئے۔ اس بحث کو خلطِ مبحث تک پہنچا دینے کے لیے میں یہ بھی کہوں گا کہ مذہب و اخلاق کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ میں مذہب و اخلاق کو افکار و اعمال میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسکس کو شعر و ادب میں (ایضاً: ۱۸)

آج سے پہلے ہمارے نوجوان خاندان کی اعلیٰ روایات کو ایک قیمتی ترکہ سمجھ کر اس کی پیروی یا اس کا احترام کرتے تھے، اور معمولی سے معمولی خاندان بھی ایسا نہ تھا، جو کسی صالح و مستند روایت کا کسی نہ کسی حد تک حامل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہو گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی ایسی متاع باقی نہ رہ گئی ہو، جس کے تحفظ یا ترقی کے لیے کسی کو اپنی بہتر صلاحیتیں بروئے کار لانے کی فکر ہو (ایضاً: ۸۶)

طلبہ کی اقامتگاہوں کے آس پاس اساتذہ، اولڈ بوائز اور دوسرے چھوٹے بڑے ملازمین اور متوسلین کے خاندان بھی دور اور نزدیک پھیلے ہوئے ہیں۔ شریف نوجوان طلبہ کی موجودگی کا احساس ان خاندانوں اور ان خاندانوں کی رہن سہن اور عزت و ناموس کا لحاظ ان طلبہ کو، غیر شعوری طور پر رہتا.... جب سے یہ ادارہ قائم ہے، آج تک کوئی ایسا حادثہ اس کے حدود کے اندر پیش نہیں آیا، جو ہمارے دیرینہ آئینِ شرافت کا منافی ہو۔ (ایضاً: ۱۱۹ - ۱۲۰)

ظاہر ہے پرانے وقت کا ہوں، راگنی بےوقت کی ہے۔ زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہوں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت

گھٹ بڑھ رہی ہے، جس چیز کو ہم متاعِ کنعاں سمجھتے تھے، وہ متاعِ کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ (گنجہائے گرانمایہ (ڈاکٹر انصاری): ۱۸)

(علیگڑھ کے طلبہ سے) آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم اپنے طرح طرح کے جن کارناموں، خدمات، اور خوبیوں پر فخر کرتے ہیں، وہ ہمارے بزرگوں کی کس مسلسل محن و مشقت، ایثار و قناعت، اور سخاوت و شجاعت کا نتیجہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا سکتی ہے، وہ نہ کسی کارنامے کی خود اہل ہوگی نہ کسی اور کی خدمات کی اہمیت اور بڑائی کا احساس کر سکتی ہے۔

(عزیزانِ علیگڑھ (مشمولہ فکر و نظر) ۱۴۴)

عزیزو! گزشتہ نصف صدی میں اخلاق کا زوال اور اعمال کے مکافات کب اور کہاں سے آئے، اور کیونکر پھیلے، ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ دو عالمگیر جہانجہاریوں کے بعد پرانی قدریں درہم برہم ہو گئیں، لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے (نئی) نہ متعین ہو سکیں، نہ قبول ہو پائیں۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، جب ہماری بیچارگی یا غفلت کا یہ حال ہو کہ زندگی اور زمانے کی بے پناہ رفتار اور راندھی شکست و ریخت نئی قدروں کو بروئے کار آنے سے پہلے پرانی بنا دیتی ہو۔

(عزیزانِ علیگڑھ (فکر و نظر): ۱۶۰)

۴۔ پرانی اور نئی نسلیں:

ذوقِ شعر و ادب کی سیرابی اور صحتمندی کے لیے شاگردی، استادی اور اعمال و افکار کے سنوارنے، سدھارنے کے لیے مرشد اور مرید یا گرو چیلے کا جو رشتہ یا ادارہ مشرق میں مدت الایام سے چلا آرہا ہے۔ وہ اپنے گوناگوں فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابلِ قدر مانا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے، اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، وہاں ممکن ہے ایک یہ بھی ہو کہ استاد شاگرد یا مرشد اور مرید کا "شخصی" رشتہ جو مدتوں سے مجرب چلا آتا تھا، اس کی طرف سے

سے ہم نے اپنی توجہ ہٹالی ہے۔ (آشفتہ بیانی میری : ۱۰۸)
وہ طالب علم ہی نہیں، بہرحال کیوں نہ ہوں، انسانیت سے گزرینگے تو انسانوں کے نزدیک قابلِ مواخذہ ٹھہرینگے۔ نوجوانوں پر یہ راز آشکار ا ہونا چاہیے کہ نالائقی کا جواز نہ مذہب ہے، نہ وطنیت، نہ سیاست، نہ مزدور، نہ سرمایہ دار، نہ خود نوجوانی۔ (آشفتہ بیانی میری : ۱۰۹)
دوسری بات یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجہ کا اظہار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس سے ان میں بے صبری، بے اعتمادی یا غیر ذمہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے ..... ظاہر ہے جہاں انقلاب بلانے اور بغاوت کرنے کا اذنِ عام ہو وہاں ریاضت اور انتظار کو کیا دخل۔
انسان کی صالح اور صحتمند زندگی کا اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے۔ اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیروزبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اقدار نتیجہ ہوتے ہیں، مدتوں کے تجربہ اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں، جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔ آج سے پہلے زندگی میں وہ "مرکز گریز" سرعت اور شدت نہیں تھی، جواب ہے (آشفتہ بیانی میری : ۸۷)
اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے، تو جہاں تک وضع قطع : رہن سہن، مرنے جینے، قدامت اور نفع رسانی کا تعلق ہے، پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارے میں نہیں ہیں۔ نئی زندگی اور نیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی، لیکن ذاتی طور پر میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر د ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی، انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعثِ خیر و برکت تھی۔ (گنجہائے گرانمایہ (احسن مارہروی) ۱۷۲۱)

نوجوانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ کبھی بوڑھے ہونگے، سمجھ میں آنے کی بات تھی۔ البتہ یہ بات تعجب اور افسوس کی تھی کہ بوڑھے اپنی جوانی بھول چکے تھے۔ اُن کو جوانوں سے چڑھ ہوگئی تھی: یہ بوڑھوں کی بھول تھی۔ (مضامین رشید (اپنی یاد میں): ۹۱)

نوجوان سو فی صدی معصوم ہوتے ہیں، نہ ان کو معصوم رکھا جا سکتا ہے۔ ... میں یونیورسٹی کے طالبعلموں کو نہ بھکشو دیکھنا چاہتا ہوں، نہ رکھنا چاہتا ہوں ..... بایں ہمہ اس کا بھی قائل نہیں کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبہ وہی شیوہ اختیار کریں، جو آج کل کی پولٹیکل پارٹیوں کے زیر اثر نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اختیار کر رکھا ہو ..... محکومی میں غلامی کو بدنصیبی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن آزادی میں مطلق مطلق العنانی تو لعنت محض ہے۔ (مضامین رشید (سلام ہو نجد پر): ۲۶۹)

جب تک انسان اس عالم آب و گل میں آباد ہے، بحیثیت مجموعی زندگی ترقی اور ابتری کی طرف بڑھتی رہیگی۔ یہ محض بوڑھوں کی فطرت ہے، جو اپنے ماضی کو مبارک اور نوجوانوں کے حال اور مستقبل کو مایوس کن بتا کر اپنے دل کو بہلاتے رہتے ہیں۔ (ایضاً: ۲۷۲)

یہ دنیا جس طرح صرف بوڑھوں سے آباد نہیں رکھی جا سکتی، اسی طرح صرف بوڑھوں کے خیالات و عقائد سے بھی زیادہ دنوں تک اس کا کام نہیں چل سکتا۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ نوجوانوں کو سہنا تو پڑے اپنی دنیا میں، لیکن رہنا پڑے بوڑھوں کی دنیا میں۔ (ایضاً: ۲۷۳)

نوجوانوں کا یہ زعم کہ وہ "سوار اشہب دوراں" ہیں، اور دوسرے یعنی بوڑھے اور کم نوجوان صرف گرد راہ، ایک ایسا مغالطہ ہے، جس میں امراض کی طرح بچّے اور نوجوان ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ زمانہ جس تیز رفتاری سے جوان اور جوان تر ہونے لگا ہے۔ اس رفتار سے خود نئی نسل ذہنی طور پر جوان نہیں رہ پاتی ..... بوڑھے ایک حد تک بہتر پوزیشن میں ہیں، اس لیے کہ انھوں نے اپنے سہارے کے لیے کچھ کھچی نیچاں قدریں سینے سے لگا رکھی ہیں، اور اقدارِ اعلیٰ کا احساس اور ان کی

پیروی ہی وہ سہارا ہے، جو انسان کا اس وقت خاص طور پر ساتھ دیتا ہے، جب تمام دوسرے سہارے ساتھ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ (ایضاً: ۲۷۴)

نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں، اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے۔ لیکن خودغرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں دیتی۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۰۶)

بیشتر طالب علموں نے غیر ذمہ داری کا جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ بالکل وہی ہے جو سوسائٹی میں نامبارک و خطرناک عوامل و عناصر کا ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی تعلیم، تربیت، تہذیب اور روزگار کے مسائل کو لا اینڈ آرڈر (نظم و نسق) کا مسئلہ بنا دیا ہے۔۔۔۔ یہ کہنے سے کام نہ چلیگا کہ پرانی باتوں کا اب چلن نہیں رہا، وہ موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہیں۔ لیکن اس سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے، نہ کوئی تسلیم کریگا کہ نئے اوضاع و اطوار بہر گونہ پسندیدہ اور قابل قبول ہیں۔ آپ کے پسند یا ناپسند کرنے سے کام نہیں بنتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کس طریق عمل سے زندگی میں بہتری اور بلندی آئی اور کس سے ادبار و انتشار۔

(عزیزانِ علیگڈھ (فکر و نظر): ۱۴۹)

آپ طلبہ سے ڈر کر آپ کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات کو جو اس طرح پیش کیے جاتے ہوں جیسے یہ تاوان جنگ، بلیک میل یا یرغمال ہو، اس طرح پیش کیے جاتے ہوں ان میں سب سے نامسعود اور عبرت انگیز یہ ہے کہ امتحان کے مقررہ ضوابط اور معیار کو گرا دیا جائے یا بالکل ختم کر دیا جائے۔ (ایضاً: ۱۶۳)

۵۔ سیکولرزم۔

(اسکول اور شوالے کی فضا کا اثر) طنز و ظرافت باوجود مدت العمر کے ادبی شغل ہونے کے آج تک اس کا اتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا کوئی فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے۔۔۔ حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ تو کبھی

نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔ (آشفتہ بیانی میری، ۲۹)

علیگڈھ سے باہر فرقہ وارانہ جھگڑے اور صوبجاتی عصبیت کے جہاں تہاں اکثر مظاہرے ہوتے رہے، لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست و نجاست سے ہمیشہ پاک رہی۔۔ ۔۔۔۔ علیگڈھ کے تعلیمیافتہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے، یا جہاں کہیں جس حال میں رہے، فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے (ایضاً، ۱۴۲)

میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہوگا، وہ قابل قبول ہے، یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی سے سابقہ ہو، وہ قابل ترجیح ہے۔ (ایضاً: ۱۶۸)

۶۔ مذہب و اخلاق: اسلام

مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر چوک ہوئی ہے، جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ جاری رہیگی۔ (آشفتہ بیانی میری: ۴۰)

ہر مذہبی آدمی اخلاقی نہیں ہوتا۔ خود غرض، ناواقف، مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب، عورت بغیر شوہر ہے۔

خود غرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں

سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اترنے کے لیے جوزینے ہیں، ان میں پہلا اخلاق، پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں۔ مؤخر الذکر تین کا نامسعود اتحاد آج عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے۔

(گنجہائے گرانمایہ (جگر مرادآبادی): ۲۴۹)

بذاتِ خود میں ہندستان کے مسلمانوں کو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔

(مضامینِ رشید (سرگزشتِ عہدِ گل): ۱۴)

میں ہر مذہب کا احترام کرتا تھا مگر مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پری کرکے اعمال کی طرف سے بےفکر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی نہیں سمجھنا چاہتے تھے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے، بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقائد و عبادت کو خدمتِ خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھیگا۔ عقائد اور اعمال کو یہ لوگ علیٰحدہ علیٰحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں... زندگی کا کیا مقصد ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا؟...... شرافت، خوشدلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے۔

(مضامینِ رشید (اپنی یادیں): ۸۲)

مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی امور وہ ہیں، جو ان کی مستند دینی کتابوں اور معتبر مسلمانوں کی سیرت و سوانح میں ملتے ہیں؛ وہ نہیں، جن کو ہم اپنے مخصوص مفاد و مقاصد کے پیشِ نظر حسبِ ضرورت اختراع کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان معاشرے میں کچھ ممنوعات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ ہوں، یا سیاسیات، سماجیات اور حیوانات کے تقاضے اور طور طریقے، تاوقتیکہ سخت مجبوری کا سامنا نہ ہو، کوئی ایسا اقدام گوارا نہیں کیا جا سکتا، جو ایسی ترغیبات کا محرک ہو، جن کو ہمارے مذہب و اخلاق نے مسلّمہ طور پر قابلِ اجتناب قرار دیا ہو۔ ممنوع کو

مستحب نہ منطق سے قرار دیا جاسکتا ہے، نہ جمالیات اور اقتصادیات کے نکات بیدلیٔ سے۔
(مضامین رشید (اسلام ہو تجدید پر): ۲۶۹)

مسلمانوں کا یہ موقف غیر متبدل اور غیر متزلزل رہیگا کہ ان کا دین و آیین اور معاشرہ عیش و طرب کا نہیں، ضبطِ نفس اور رفاہ و ریاضت بالفاظ دیگر فوجی ڈسپلن کا ہے۔ ظاہر ہے، جس ملت نے اس ڈسپلن کے ساتھ نوعِ انسان کے فوز و فلاح کی اتنی بڑی ذمے داری قبول کی ہو، وہ طرب و تفنن کی زندگی نہ بسر کرسکتی ہے نہ اسے کرنا چاہیے۔ فنونِ لطیفہ اور اس کے عوارض و عواقب کو اگر اسلامی شریعت نے زندگی میں وہ اہمیت یا وقعت نہیں دی ہے، جو آج کی دنیا دے رہی ہے، تو نہ شرمانے کی ضرورت ہے، نہ معذرت خواہ ہونے کی۔ (ایضاً، ۲۷۱)

مسلمانوں کا صحیفۂ مذہب و اخلاق دوسروں کے صحیفۂ مذہب و اخلاق سے زیادہ ہمہ گیر ہی نہیں، سخت گیر بھی ہے۔ ... جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندستان کے مسلمان ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابلِ تقلید ہیں، نہ کہ اس کا عکس۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں وہ جاتی کہ بحیثیتِ مجموعی ہندستان کے مسلمانوں کی سب سے بہتر نمایندگی علیگڈھ کرتا ہے۔
(ایضاً: ۲۷۱)

عبادت کا مفہوم یا مقصد یہ نہیں کہ خدا سے مزدوری، خیرات، انعام، تاوان وصول کرنے یا دوسروں پر فضیلت اور تفوق جتانے یا ان کو سنگسار کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا ہو۔ ہر پندار بد اخلاقی ہے، لیکن عبادت کا پندار لعنت ہے۔
(ہمارے ذاکر صاحب: ۱۴۲)

عبادت زندگی کو قبول کرنے کا اقرار و اقبال اور سعی عمل ہے۔ عبادت پیشہ اور عبادت گزار کا فرق یہ ہے کہ اول الذکر، اپنی عبادت اور احسانات سے ہر وقت، ہر کس و ناکس کو مطلع کرتا رہیگا، جیسے ان کو چیلنج دے رہا ہو۔ عبادت گزار اپنی

خدمات کو نہ کبھی ظاہر کریگا، نہ ظاہر ہونے دیگا بلکہ اس پر شرمندہ رہیگا اور شکر گزار کہ خدا کی دی ہوئی زندگی جیسی نعمت اور سرفرازی کے مقابلے میں اس کی خدمات کتنی ناچیز ہیں .... خدا کی صفات کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کو دھوکہ دینے کی کوشش ایسی حماقت ہے، جس کے ارتکاب کی ایک عبادت پیشہ ہی جرأت کرسکتا ہے ۔

(ایضاً : ۱۴۳)

مذہب کے دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً دیکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں یعنی مذہب و اعتقاد میں گرہ بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے ۔

(ایضاً : ۱۴۸)

انسانی زندگی کے تقاضوں کو اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں سمجھنے اور پورا کرنے میں جتنے واضح اور مکمل آداب و ہدایات نماز میں ملتے ہیں، وہ بمشکل کہیں اور ملینگے۔ مقررہ نماز پنج وقتہ ہوتی ہے، لیکن اس کی ڈسپلن ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب نفس اسی ڈسپلن کا عطیہ ہے۔ اگر یہ ڈسپلن پوری نہیں ہوتی، تو نمازی کو سمجھ لینا چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کے تقاضے پورے ہوئے، نہ منشاے الٰہی کی تعمیل ہوئی ۔

(ایضاً : ۱۶۰)

مذہب کی بڑائی کا ہمیشہ قائل رہا ۔ ایسا نہ کروں، تو اپنی کس خوبی پر بھروسہ یا فخر کرسکونگا، لیکن اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ مذہب دراصل اتنا کسی کو بناتا یا بگاڑتا نہیں، جتنا اس کو بےنقاب کر دیتا ہے۔ کم سے کم آج کل کے مسلمانوں میں تو یہی دیکھنے میں آرہا ہے، بالخصوص ایسے مسلمانوں میں جو مذہب کے کاروبار، نفع و نقصان کے خطوط پر کرتے ہیں، نفع اپنا، نقصان مذہب کا، یا چاہے جس کا۔

(ایضاً : ۱۷۳)

(تقسیم ملک کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو مشورہ) ان حالات میں غالباً اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم ہر طرح کی تعمیری اور تخلیقی لیاقت پیدا کرنے میں اس خوے گدایانہ اور رسم نوحہ گری

کو ترک کردیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلاف کے کارناموں سے اپنی بڑائی جتانا اور ان کے نام پر بھیک مانگنا یا بے لگام ہونا بڑی نادانی اور بے عزتی ہے۔

(فکر و نظر (عزیزانِ علیگڑھ) ۱۹۸۱)

۷۔ سماجی اخلاق:

یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنوں کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف پر ہیجل اور بیجا آوازے کستے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیز حاصل کر لی جائے اور وہ لوگ جو اعلیٰ نتائج کے لیے اعلیٰ صفات کام میں لاتے ہیں ان کو زک پہنچائی جائے۔ ۔ ۔ ۔ ذاکر صاحب کا یہ کہنا مجھے بہت پسند آیا کہ اسپورٹسمین شپ کا تقاضا یہ ہے کہ جس ٹیم کے خلاف تماشائیوں کی طرف سے ناروا باتیں سرزد ہونے لگیں، اس کی مقابل ٹیم کو چاہیے کہ کھیلنے سے انکار کر دے اور اس وقت تک کھیلنے پر راضی نہ ہو، جب تک مجمع اس بات پر آمادہ نہ ہو جائے کہ وہ دونوں ٹیموں کے ساتھ یکساں سلوک کرےگا۔

(آشفتہ بیانی میری: ۷۹)

میرا کچھ ایسا بھی خیال ہے کہ سرمایہ و مزدور، زمیندار اور کسان، ظالم و مظلوم اور متعلقہ مسائل کی خرابیوں کی اتنی مذمت کی گئی ہے کہ اب ہر کس و ناکس خواہ وہ مستحق ہو یا نہیں، غیر شعوری طور پر سمجھنے لگا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ وہ مدد کا مستحق ہے... چنانچہ اپنی دشواریوں کو محنت اور ایمانداری سے دور کرنے کے بجائے تقریباً ہر شخص یہ ماتم کرتا نظر آتا ہے کہ دوسرے اس کا حق غصب کر رہے ہیں؛ جیسے کسی خواہش کا پیدا ہو جانا ہی اس کے پورا کیے جانے کے لیے سندِ جواز ہو، اور جس شخص کی خواہش پوری نہ کی جا سکے، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ سوسائٹی پر لعنت بھیجے، اور قانون اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح کی باتوں سے ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں ذمے داری کا احساس کم اور ناحق کوشی کا بڑھتا جا رہا ہے۔ (ایضاً: ۸۸)

بحیثیتِ مجموعی میں اس درسگاہ کی صحتمند یا غیر صحتمند فضا کی نشانی اس میں تلاش کرتا ہوں کہ یونین کے الیکشن میں امیدوار کس چیز کا سہارا پکڑتے اور کامیاب ہوتے ہیں، اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری اور ادارے کی علمی اور اخلاقی منزلت کا یا مذہب و مسلک کے اختلافات اور ذاتی یا بیرونی اغراض و مقاصد کی حمایت کا۔

(ایضاً: ۹۰)

جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے، اسی حد تک اس کی بڑائی دوسری قوموں میں مسلّم ہوتی ہے۔ (ایضاً: ۱۱۶)

قتل، اغوا ذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں، لیکن زنانہ پن یا شہد پن کے مقابلے میں قتل اغوا ذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس و جسم کی نمائش یا تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے، مسلمان مردوں کا یہ وطیرہ نہ ہونا چاہیے۔

(مولانا احسن مارہروی (گنجہائے گرانمایہ): ۱۷۴)

گفتگو کرنا ایک سفر کے مانند ہے۔ اچھا آدمی ہمسفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اچھے آدمیوں کی نہیں، اچھے لکھنے والوں کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے اور گفتگو کرنے میں بھی رونا، گرہ گرمانا، حکم چلانا یا قابلیت جتانا، ناا ہلوں کا کام ہے۔

(مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۹)

"ڈانڈی کا منظر بھی کس درجہ عافیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں تو صرف عورتوں کو بیٹھنا چاہیے، وہ بھی تفریحاً نہیں انتقاماً۔ مردوں کو اس سواری میں دیکھ کر اکثر جی میں آیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے درمیان سے ایک ڈنڈا نکال دیا جائے، جس کے دونوں سروں کو قلی اٹھالیں اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس زندہ لاش کو نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر سے جاکر اس طور پر پھینکیں کہ یہ جھیل کے عمیق ترین حصے میں جاکر گرے۔

(مضامینِ رشید (مثلث): ۲۵۰)

ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرنے والوں کو دیکھ کر مجھے کافی غصہ آتا ہے۔ یہ غصہ فرو ہونے پر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ڈانڈی اور رکشا پر صرف ماڈرن عورتوں یا مایوس العلاج مریضوں کو بٹھانا چاہیے۔ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹھا ملے، تو اُسے کسی ترکیب سے سفرِ آخرت پر روانہ کر دینا چاہیے۔ (خنداں (سفر): ۴۳)

چوری کرنا ضرور بری بات ہے، لیکن فاقے سے ہلاک ہو جانا اس سے بھی بُرا ہے۔ شکم سیر چوری کریں یا نہ کریں، فاقہ کش کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ دوسروں کی حق تلفی اتنی سنگین بات نہیں، جتنا اپنے حقوق سے محروم ہونا عبرتناک اور درد انگیز ہے (خنداں (ناصح): ۲۶۹)

ہمارا مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم اپنے اچھے افراد، اداروں، اقدار، روایات اور اخلاق و مذہب میں کوئی نہ کوئی خامی فرض کر لینے اور اس کے اچھالنے میں غیر معمولی تسکین و فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک کوئی بڑائی بڑائی نہیں ہے غلط اندیشی یا خوش فہمی ہے۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۳۱)

حق العباد کو پورا کرنے میں جو تقصیر ہوئی ہوگی اس کو (اللہ) اپنی طرف سے معاف نہ کریگا، بلکہ معاف کرنے کا تمام تر حق یا اختیار اس کا ہوگا جس کی حق تلفی کی گئی ہوگی۔

ظالم کو سزا خدا دیگا، یا دنیا کا مقررہ قانون اور عدالت۔ ظالم کو معاف صرف مظلوم کر سکتا ہے۔

یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑی کہ عبادت پیشہ حضرات عبادت پر زیادہ بھروسا نہ فرمائیں۔ خلق کی خدمت و خیر خواہی سے خالی ہے، تو ایسی عبادت وادیِ غیر ذی ذرع ہے، جہاں نہ پانی ہے نہ پودا، نہ پرندہ نہ گل (ایضاً: ۱۴۴)

تسخیر فطرت انسان کا جتنا قابل فخر کارنامہ ہے، اتنا ہی اپنے پر تسخیر پانے میں ناکامی اس کا المیہ ہے۔ امریکہ نے چاند پر پانو رکھ دیا، لیکن کالے پر اس کا پانو جہاں کا تہاں ہے۔ (ایضاً: ۱۴۷)

کھدر کے اوصاف کے بہت لوگ قائل ہیں۔ میں اس کو اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ احترام سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم روایت اور عظیم شخصیت کا نشان یا سمبل ہے، جس نے ہندوستان کو اس کی اخلاقی روایات، ملکی اور قومی ذمہ داریوں اور عالمی تقاضوں سے

آشنا کرایا۔ مجھے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔
(ایضاً : ۱۶۶)

زندگی کی خوشی اس میں نہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج و راحت میں اور کتنے ہمارے رنج و راحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزت و محبت کی زندگی کہتے ہیں، جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ (ایضاً : ۱۹۰)

جب سے اشتراکی طریقِ فکر و عمل کا آغاز ہوا، فرد، سماج، ادارے، مذہب، حکومت، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، اقدارِ عالیہ میں ایسا عالمگیر ہیجان، فساد و فتور آیا کہ اب تک کوئی دوسری طاقت اس کو صحت و اعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔
(فکر و نظر (عزیزانِ علیگڈھ) : ۱۶۵)

لباس کو ستھرا، خوبصورت، آرامدہ، قرینِ حیا اور موسم و موقع کے اعتبار سے موزوں ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو جس سے کوئی نازیبا نمایش مقصود ہو۔ سر کو ڈھکے رکھنا مشرقی تہذیب میں ضروری سمجھا گیا ہے...... شیروانی اور اچکن میں کسی شخص کو برہنہ سر سڑکوں پر یا تقریبوں میں دیکھتا ہوں تو اس کی وقعت کافی حد تک نظروں سے گر جاتی ہے۔
(ایضاً : ۱۷۴)

آدمی کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کا پتہ دو موقعوں پر آسانی سے لگ جاتا ہے، ایک بولنے میں، دوسرے کسی کے ساتھ طویل ریلوے سفر میں (ایضاً : ۱۷۷)

گفتگو کے معمولی آداب میں سے یہ ہے کہ اپنی بات سنجیدگی سے کہیے اور دوسرے کی تحمل سے سنئے۔ اپنی بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے عقل، معتدل المزاج اور سلامت طبع سے کام لیجیے۔ طنز و تہتک، شور و شغب اور ہرزہ سرائی جاہلوں کا شیوہ ہے۔ (ایضاً : ۱۷۷)

۸۔ فرد کا اخلاق، اپنے بارے میں:۔

علیگڈھ کی زندگی میں جہاں گزشتہ مصائب کو بھول چکا تھا، وہاں ان ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کر گیا، جو بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔

وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں، اتنا ان کے رنج و راحت سے میں نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ نفس حیلے تراشتا ہے، تو اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔ (گنجہائے گرانمایہ (سید سلیمان اشرف): ۵۱)

(اصغر گونڈوی نے الہ آباد میں انھیں مزید روکنا چاہا، یہ نہ رکے) "وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، تو اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا، لیکن مرحوم کو جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا، اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔

(گنجہائے گرانمایہ (اصغر حسین اصغر گونڈوی: ۱۱۹)

کسی کی خوبیوں کو جتلانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا۔ لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا، اس لیے کہ دیکھا اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بُرے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی طرف ایک آدھ کمزوری کو اپنی بداعمالی اور بےراہروی کے جواز میں چن لیتے ہیں۔

(گنجہائے گرانمایہ (بابائے اردو مولوی عبدالحق): ۲۹۶)

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر شغل چپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ ۔ ۔ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فنکار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں، اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (ایضاً: ۲۹۷)

اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا یعنی میں جس کو دوست سمجھتا، یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا، یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں تامل نہ کرتا۔ الیکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا، خواہ فریق مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو۔

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی؛ میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی یعنی

یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجتمند کی اپنے حوصلے یا اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا، یا میرا کوئی ایسا دولتمند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی، تو وہ میری خاطر اسے پورا کر دیتا۔ (مضامینِ رشید (اپنی یاد میں) : ۸۵)

حماقتیں میں نے اکثر کی ہیں سازش کبھی نہیں کی۔ (ایضاً : ۸۵)

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بد توفیقی تھا۔ (ایضاً : ۸۶)

مجھے درباداری سے سخت نفرت تھی۔ درباداری کے وہ لوگ محتاج ہوتے ہیں، جو خود اپنی نظر میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں .... درباردار پر صرف لعنت بھیجی جا سکتی ہے (ایضاً ۸۷)

جب ابتری عام ہو، اس وقت ایک اچھا اور بڑا شخص تنہا وہ کر سکتا ہے، جو فوج، پولس، الکشن، کانفرنس، لوتھر۔ نیپٹول، طالب علم اور سادھو علیحدہ علیحدہ اور مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے۔ اصلاح و امن کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک پیغمبر بھیجا ہے، افواج کبھی نہیں بھیجیں۔

(ہمارے ذاکر صاحب : ۱۵۶)

۹۔ شاعر و فنکار، فنونِ لطیفہ۔

شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں فنکار کی شرافتِ نفس کے عنصر کو جتنی اہمیت دی جائے، بجا ہے۔ حالی انسان کی حیوانی سرشت نہیں، انسانی سرشت (حیا و حمیت) پر زور دیتے ہیں۔ اقدارِ عالیہ اور اقدارِ مطلقہ کا جواز اور مدار انسان دوستی پر ہے، جس کے لیے ابتدائے تہذیب سے آج تک اچھے اور بڑے انسان ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور قربانی دیتے گئے ہیں۔ جب انسان کا معیار "انسان اور انسانیت" ہو تو اس کے حسنِ عمل یعنی شعر و ادب کو بھی انسان و انسانیت ہی کے معیار سے پرکھنا چاہیے۔ ہم میں شاعر اور ادیب کی آزادیِ فکر کا غلط اور بڑا خطرناک تصور راہ پا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شاعر اور انشا پرداز یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہر طرح کی بات

جس طرح چاہیں لکھ سکتے ہیں۔
نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں، اس میں فنونِ شریفہ کے آداب کہاں سے آئیں گے۔ (گنجہائے گرانمایہ (سجاد حیدر یلدرم): ۲۰۸)
شاعر کے ظرف و ذوق کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ عورت اور متعلقہ جذبات کا کس طرح اظہار کرتا ہے۔ وہ عورت کو جسم کی لذت کا صرف ایک وسیلہ سمجھتا ہے، یا اس کو ایک قدرِ اعلیٰ اور ایک تہذاری بھی مانتا ہے۔

(گنجہائے گرانمایہ (جگر): ۲۵۷)

۱۰۔ جنس، عورت۔

شہوت، غصہ، نفرت، خود نمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں، اور کم و بیش ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا، لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا۔ بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے۔ جو محسوس کرے، اسی کو ظاہر کرنا قرینِ فطرت یقیناً ہے، قرینِ انسانیت نہیں ہے (ایضاً: ۲۵۸)
جنسی میلانات کو بڑی اچھی چیز سمجھتا تھا۔ لیکن جنسی میلانات کو بدوضعی کا بہانہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ان میلانات کی موجودگی مستحسن ہے، ان کا مظاہرہ مذموم ہے۔ ہر انسانی فعل کا محرک جنسی میلان ہو سکتا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک جنسی میلان کا ارتکاب نہ کر لیا جائے، اس وقت تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے۔

(مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۸۸)

آسٹریا کے مشہور فلسفی اور دانشور سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶ - ۱۹۳۹ء) کے نظریۂ حیاتِ جنس کو لیجیے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے ہر فعل کی محرک اس کی جنسی جبلت ہے۔ اس انکشاف نے انسان کے اخلاقی اقدار و کردار اور ان کی لائی ہوئی ہزاروں سال

کی برکت اور برگزیدگی کو جس طرح مسخ و مسمار اور انسان کی ترقی کی رفتار اور سمت کو جن بد اعمالیوں کی طرف موڑ دیا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ نوجوانوں کی اعلیٰ تعمیری صلاحیتوں کو مسخ کر کے اس نظریے نے فنونِ لطیفہ و عالیہ کو جس طرح ماؤف کیا ہے اور ان کے ماؤف ہو جانے سے نوجوانوں کے صالح فکر و عمل پر جیسا ہمہ گیر و عالمگیر دردناک اثر پڑا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔

(فکر و نظر (عزیزانِ علیگڈھ): ۱۵۰)

جنس کی تخلیقی مصلحت اور اخلاقی ذمّہ داریوں کو نظر انداز کر کے جنس کی جس بے لگام اور غیر فطری ہوسناکی و لذّت کوشی کا مغرب شکار ہوا اور ہے، اس کی ایک قابلِ رحم اور عبرتناک انگیز مخلوق وہ ہے جسے ہم "ہپّی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (ایضاً: ۱۵۴)

مرد اور عورت جس طرح نسلِ انسانی کے قیام و بقا کے ضامن اور لازم و ملزوم ہیں، اور جنسی روابط میں جو زبردست اور ناقابلِ تسخیر لذّت و کشمکش رکھی گئی ہے، جس سے کوئی متنفس خالی نہیں ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری کس غیر معمولی احتیاط و احترام کا مستحق ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے ہر مذہب و اخلاق نے ہمیشہ سے ان روابط کو اعتدال پر رکھنے کے لیے سخت شرائط کا پابند رکھا ہے (عزیزانِ علیگڈھ: ۱۵۵)

عورت کی آزادی یا نجات کا یہ تصوّر نہ صحیح ہے، نہ صالح کہ وہ ہر مرد کے لیے ہو، اور ہر مرد اس کے لیے ہر موقع پر اور ہر غرض سے دستیاب ہو، جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مرد کے لیے عورت کا منجملۂ اسبابِ تفریح و طرب ہونا، نہ عورت کے شایانِ شان ہے، نہ مرد کے۔ موافق سے موافق اور مبارک سے مبارک حالات میں رہ کر آزادی اور یکساں حقوقِ شہریت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر عورت کے فرائض میں ہے کہ وہ اچھی سے اچھی ماں اور بہتر سے بہتر بیوی کا رول ادا کرے (ایضاً: ۱۵۵)

جنس کا یا سیکس کو سائنس اور ٹکنالوجی کے اس "دورِ قمر" میں چاہے، جو حیثیت حاصل ہو، زندگی کو سمجھنے اور برتنے میں اس کو وہ درجہ نہیں دینا چاہیے، جیسے زندگی سیکس کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ زندگی صرف جنس کے تقاضوں سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم ذمّہ داریوں

کے احساس اور ان ذمہ داریوں کے دیے ہوئے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ (ایضاً: ۱۵۸)

گناہوں کو گناہوں سے ڈھکنا یا ایک کو دوسرے سے سند جواز دینا آج کل کی دانش اور دانشوروں کا کمال یا ذمہ داری سمجھی جانے لگی ہے۔ جس گناہ کو ابتدا سے اب تک ہر مذہب اور صحیفۂ اخلاق میں گناہ ہی سمجھا گیا ہو اس کو زندگی کا طرز فکر اور طریقۂ عمل بنا لینا کتنی مایوس کن اور تشویشناک صورت احوال ہے۔ (ایضاً: ۱۵۹)

ماخذ

۱۔ آشفتہ بیانی میری: سرسید بک ڈپو، علیگڑھ (طبع اول، فروری ۱۹۵۸ء)
۲۔ مضامین رشید: انجمن ترقی اردو ہند (۱۹۶۴ء)
۳۔ گنجہائے گرانمایہ: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (اکتوبر ۱۹۶۲ء)
۴۔ خنداں: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (مارچ ۱۹۶۵ء)
۵۔ ہمارے ذاکر صاحب: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (اگست ۱۹۷۳ء)
۶۔ سرِ یزدانِ علیگڑھ: مشمولہ فکر و نظر ۱۹۷۲ء (جلد ۱۲: شمارہ ۱۰۲)

لطائفِ رشید

سلیمان اطہر جاوید (ڈاکٹر)

پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ رشید صاحب ہمیشہ عید پر ان کے مکان پر ملاقات کو جایا کرتے تھے۔ جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد کسی کو اطلاع دیے بغیر وہ لکھنؤ چلے گئے۔ دو دن بعد بقرعید تھی۔ رشید صاحب حسب معمول عید ملنے ان کی کوٹھی پر گئے، تو لائبریری کے ایک کارکن مشتاق حسین صاحب نے بتایا کہ حلیم صاحب تو لکھنؤ گئے ہیں۔ رشید صاحب نے کہا: وہ اپنی خو بدلیں، تو بدلیں؛ لیکن مشتاق صاحب، آپ گواہ رہیے گا کہ ہم نے اپنی وضع نہیں بدلی۔

ایک خاتون جو رشید صاحب کی بہت مداح تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملاقات کو آئیں۔ دوران گفتگو میں کہنے لگیں میں آپ کو اس وقت سے جانتی ہوں، اور جب ہی سے پسند بھی کرتی ہوں، جب ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رشید صاحب نے فوراً جواب دیا: غضب کیا آپ نے کہ مجھے جانتی تو آپ شادی سے قبل سے ہیں، اور ملاقات کو اب اس وقت آئیں، جب آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

حکیم عبداللطیف اور رشید صاحب نینی تال میں تھے۔ شام کے وقت سیر کو نکلے، تو کچھ دیر

ستانے کو ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ان سے بلندی پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے دو چار کنکر لڑھک کر نیچے آئے، اور ان میں سے ایک رشید صاحب کے چشمے پر لگا۔ رشید صاحب نے حکیم صاحب کو مخاطب کر کے کہا: حکیم صاحب، آپ نے کچھ کیا ہو، تو کیا ہو، لیکن سنگسار میں کیا جا رہا ہوں۔

ظہیر احمد صدیقی (پروفیسر)

ملک کے ایک افسانہ نگار کو اپنے افسانے پڑھ کر سنانے کا بیحد شوق تھا؛ اگر افسانہ مکمل نہ ہو تو پلاٹ ہی سنا دیتے تھے۔ ایک دن وہ رشید صاحب کو اپنے ایک افسانے کا پلاٹ سنا رہے تھے۔ ان کا تکیۂ کلام تھا: "دیکھا آپ نے" "دیکھا آپ نے" جسے وہ بار بار دہراتے جا رہے تھے رشید صاحب حسبِ معمول پان کھا رہے تھے اور سر جھکائے کچھ لکھنے میں مشغول تھے؛ اور یہ صاحب اپنا پلاٹ سنا رہے تھے اور پڑھ رہے تھے۔

"ایک سنسان بیابان تھا (دیکھا آپ نے) رات کا سناٹا ہُو کا عالم۔ ....
(دیکھا آپ نے) اسی سناٹے میں ایک اُلّو اڑا (دیکھا آپ نے)۔

رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور کہنے لگے: "جی ہاں حضرت! دیکھ رہا ہوں"۔

علیگڈھ کی نمایش کے مشاعرے کی صدارت گوپی ناتھ امن لکھنوی فرما رہے تھے۔ طلبہ اور ایک شاعر میں جھڑپ ہو گئی، جس کی وجہ سے مشاعرے میں یک گونہ بدمزگی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ جب دوسری مرتبہ امن صاحب علیگڈھ تشریف لائے، تو گفتگو کے دوران میں رشید صاحب نے ان سے دریافت کیا: "امن صاحب! آپ یہاں کے لڑکوں کے رویے سے کچھ آزردہ تو نہیں ہوئے؟" امن صاحب نے جواب دیا: "نہیں، آزردگی کی کیا بات ہے؟ ابھی حال میں میرٹھ کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا؛ وہاں اس سے بھی بڑھ کر بدنظمی دیکھی"۔

بیساختہ رشید صاحب نے ہنس کر کہا، "سچ ہے جہاں اس طرح کا آشوب نمایاں ہو، وہیں امن کی ضرورت ہوتی ہے"۔

ایک دن مسز ممتاز حیدر صاحبہ (پرنسپل گرلز کالج، علیگڈھ) نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ گرلز کالج کی میٹنگ کے لیے تاریخ مقرر کر دیں۔ رشید صاحب نے جواب میں لکھ دیا کہ "تاریخ تو لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے؛ آپ مجھ سے تاریخ کے تعین کا اصرار کر رہی ہیں۔"

میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور رشید احمد صدیقی صاحب کلاس لے رہے تھے۔ موضوع زیرِ بحث مومن کی شاعری تھی۔ رشید صاحب نے دریافت کیا:

"حضرت! مومن کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے عرض کیا "جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، مومن نوازوں نے جتنا مومن کو بڑھا دیا ہے، اتنے بڑے شاعر وہ نہیں ہیں۔"

فرمانے لگے "جناب یوں نہیں مانوں گا۔ یہ بتائیے کہ آپ کو اپنے والد صاحب قبلہ (پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔ شارحِ دیوانِ مومن) سے اختلاف ہے یا اتفاق؟ غالباً یہ آپ کی دکھتی رگ ہوگی۔"

میں نے شرارتاً عرض کیا "میں انتہائی ادب سے اختلاف کی جسارت کروں گا۔"

کہنے لگے: "بھئی آج تک تو یہ سنتے آئے تھے، لیکن آج اس کی تصدیق بھی ہوگئی:

پسرِ نوح با بداں بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد"

رشید صاحب کے پاس یونیورسٹی کے کچھ ممبرانِ اسٹاف بحث کرتے ہوئے آئے۔ بحث اس مسئلہ پر تھی کہ ایک عورت کا اگر پہلا شوہر طلاق دے دیتا ہے یا وہ مر جاتا ہے، اور عورت دوسری شادی کر لیتی ہے، تو اس عورت کے پہلے اور دوسرے شوہر کا آپس میں کیا رشتہ ہوگا۔ رشید صاحب نے برجستہ جواب دیا "ہم زلف کہہ لیجیے۔"

حشمت حسین عثمانی۔

غالباً ۱۹۳۴ء کے جاڑوں کی ایک رات تھی۔ علیگڈھ یونین ہال میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جگرؔ مرادآبادی کی آمد آمد تھی، اور مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ بدنظمی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جلسہ کی صدارت رشید احمد صدیقی صاحب فرمائینگے اور حضرت جگرؔ مرادآبادی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ اس کے بعد چند مقامی اور بیرونی شعرا کا نام ان کے مدارج کی ترتیب سے پکارا گیا۔ مگر مجمع کو قرار نہ تھا، جو جگرؔ صاحب کا کلام سننے کے لیے بیتاب تھا۔ یہاں تک کہ لوگ فرش پر بیٹھے رہنے کے بجائے کھڑے ہو گئے جس سے صاحب صدر و شعرا نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ قریب تھا کہ مجمع بے قابو ہو جائے۔ اتنے میں رشید صاحب نے مائکروفون اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: حضرات! جگرؔ صاحب آگئے ہیں اور وہ میری تحویل میں ہیں۔ وہ ضرور آپ کو اپنا کلام سنائینگے، بشرطیکہ آپ میری بات سنیں۔ اس پر مجمع خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رشید صاحب نے اپنے خصوصی انداز میں حاضرین کو محبت آمیز لہجہ میں سرزنش کی اور علیگڈھ کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نظم و ضبط کی اپیل کی۔ فرمایا: "دنیا میں دو ہستیاں شاید سب سے زیادہ قابلِ رحم ہوتی ہیں، ایک بارات کا دولھا اور دوسرا مشاعرہ کا صدر۔ پہلی حالت عرصہ ہوا، مجھ پر گزر چکی اور خدا نہ کرے دوبارہ گزرے۔ دوسری حالت سے آج دوچار ہو رہا ہوں۔ آپ نے مجھ جیسے نقیدالّلسان اور رنگ نجع بیان کو مشاعرے کی صدارت کے لیے نامزد کر کے دانشمندی یا غیر دانشمندی کا ارتکاب کیا ہے، اس سے اب مفر ممکن نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے صبر اور اپنے سکون کو معرضِ امتحان و خطر میں نہیں ڈالینگے"۔ اس کے بعد جگرؔ صاحب سے خاص فرمائش کر کے ان کی ایک مشہور غزل سے مشاعرے کا آغاز کرایا۔ گفتار و اشعار کی اس حسین بوقلمونی کے ساتھ جب معرکۃ الآرا مشاعرہ اختتام پذیر ہوا، تو لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ حاصلِ مشاعرہ صدر کی تقریر تھی یا شعرا کا کلام!

—

رشید صاحب کے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو ہونے سے پہلے ان کے پیشرو مولانا احسن مارہروی تھے۔ مولانا حضرت داغ کے شاگرد عزیز اور ان کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے جب مولانا کے انتقال کی خبر رشید صاحب کو ملی، تو بے اختیار فرمایا:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

اور طلبا بھی ان کے ساتھ آبدیدہ ہو گئے۔

ان کے ایک شاگرد رشید جے پور کا مخمل جوتا بنوا کر لائے اور بڑی عقیدت و احترام سے خود انھیں پہنانے لگے۔ شاگرد نے احتراماً کہا کہ پاؤں تک بشکل رسائی ہوئی ہے، محروم نہ کیجیے۔ رشید صاحب نے برجستہ فرمایا: "سر حاضر ہے"۔

عید کی تہنیت کے لیے لوگ رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے اور رشید صاحب انھیں مٹھائی، سوئیاں اور پھل پیش کر رہے تھے۔ ایک صاحب کی نگاہ سنگتروں پر تھی مگر وہ اسے اٹھانے میں پس و پیش کر رہے تھے کیونکہ وہ کچھ ترش قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ رشید صاحب نے فرمایا: کھانے والے کا احسان ہوگا میرے اوپر، شوق فرمائیے"۔

محمد حسن (پروفیسر)

علیگڈھ میگزین (اردو) کے ایک مدیر خاصے بدخط تھے۔ انھوں نے اداریہ لکھ کر رشید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ رشید صاحب نے جہاں تہاں سے دیکھا، کچھ ترمیم اور اضافے کے بعد انھیں واپس کر دیا اور لکھ بھیجا: "اداریہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جناب! یہ آپ پاؤں سے لکھنے کی عادت کب چھوڑیں گے؟"

انھیں مدیر نے علیگڈھ میگزین کے مندرجات کے شاعرانہ عنوانات فہرستِ مضامین میں تجویز کیے تھے، مثلاً منظومات کے حصے کا عنوان تھا: "گل پیرہن" اسی طرح دوسرے عنوانات

بھی خاصے شاعرانہ تھے۔ رشید صاحب نے ان تمام عنوانات کو قلمزد کر دیا اور کہا "اور تو سب ٹھیک ہے، لیکن یہ طوائفوں کے سے نام بدل دیجیے"!

ڈاکٹر عبدالعلیم، شعبۂ عربی وعلومِ اسلامیہ کے صدر تھے۔ علیم صاحب، لینن کی سی مختصر ڈاڑھی رکھتے تھے، اور یہ ڈاڑھی اُن کی شخصیت کا جزو ہوگئی تھی۔ علیم صاحب علیگڈھ یونیورسٹی میں مقنن اور یونی ورسٹی کے معاملات میں قانوندان کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ایک دن میں نے رشید صاحب کی موجودگی میں علیم صاحب سے پوچھا: "یہ آپ کو قانون سے دلچسپی کیسے اور کب سے پیدا ہوگئی؟"

علیم صاحب بتانے لگے: "میرے والد وکیل تھے، وہ صرف ایسے مقدمات لیتے تھے، جن کے بارے میں انھیں یقین ہو کہ: کا مؤکل حق پر ہے جب میں بچہ تھا۔۔۔"

رشید صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کبھی بچے بھی تھے؟"

یہ جملہ اس وجہ سے بڑا برمحل تھا کہ علیم صاحب کم سخنی، سنجیدگی اور وقار کا مجسّمہ تھے۔

حیدرآباد کی رضاکار تحریک کے رہنما قاسم رضوی کبھی علیگڈھ کے طالبِ علم رہے تھے۔ اس زمانے میں رشید صاحب فارسی پڑھانے پر نئے نئے مامور ہوئے تھے۔ پہلے ہی کلاس میں قاسم رضوی سے سابقہ پڑا۔ رشید صاحب نے عرفی یا انوری کا قصیدہ پڑھانا شروع کیا۔ مطلع ہی پڑھا تھا کہ قاسم رضوی نے مطالبہ کیا کہ اس شعر کی تقطیع کر دیجیے۔ رشید صاحب کو بُرا لگا کہ اس شخص کو معلوم ہے کہ عروض وغیرہ سے میں دور بھاگتا ہوں، پھر اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ میرا پہلا کلاس ہے اور اس طرح کسی کو تنگ کرنا علیگڈھ کے شیوے کے خلاف ہے۔ مگر انھوں نے بے تامّل تقطیع کر دی: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ قاسم رضوی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ رشید صاحب نے سوال کیا: "آپ مطمئن ہوگئے؟" قاسم رضوی نے کہا: "جی ہاں"

رشید صاحب نے کہا "ویسے جو تقطیع میں نے کی، وہ غلط تھی" اس پر زبردست قہقہہ

پڑا اور قاسم رضوی ایسے شرمندہ ہوئے کہ دوبارہ کلاس میں کبھی تنگ نہ کیا۔

رشید صاحب سے ایک بار میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک بڑے شاعر کی کیا پہچان ہے؟"
فرمایا: "جو شاعر خدا سے جتنا بیباک اور عورت سے جتنا محتاط ہو، وہ اتنا ہی بڑا شاعر ہے"

علیگڑھ میں ایک زمانے میں استاد چھوارا کے نام سے ایک شخص ہوتے تھے۔ موزوں طبع تھے۔ کچھ امرد پرستی کا ذوق تھا، کچھ وضع قلندرانہ تھی، مفلوک الحال رہتے تھے۔ مگر ہر مشاعرے میں ضرور پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار کسی مشاعرے سے نکل رہے تھے، رشید صاحب نے پوچھا: "استاد! آپ نے کلام نہ سنایا"۔
استاد نے ازراہِ انکساری کہا: "بھلا ہم جاہل کیا کلام سناتے"۔ رشید صاحب نے کہا: "نہیں استاد، کبھی کبھی جاہل بھی بڑے پتے کی بات کہہ جاتا ہے"۔ استاد نے برجستہ کہا: "آپ نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔"

میرے ڈراموں کا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیں" چھپ کر آیا، تو میں نے ایک جلد رشید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بعض اوراق کے دونوں طرف، پتلا کاغذ ہونے کی وجہ سے، سیاہی پھوٹ آئی تھی۔ رشید صاحب نے ایسے ہی ایک ورق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور فرمایا: "پیسہ بھی ہے اور پرچھائیں بھی"۔

ایک خاتون کا ناول چھپ کر آیا، نام تھا: "راہِ عمل" کہنے لگے: "لیجیے، اب عورتیں بھی راہِ عمل دکھانے لگیں"۔

ایک دفعہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ بیویاں اور نوکر کبھی شوہر اور آقا کے معترف نہیں ہوئے۔ فرمایا: "میں تو حضرت محمد کو رسول خدا اسی بنا پر مانتا ہوں کہ ان پر سب سے پہلے ان کی بیوی ایمان

لائی تھیں جب تک واقعی پیغمبر نہ ہو، بیوی ایمان نہیں لاسکتی۔"

اقبال علیگڈھ آئے، تو رشید صاحب نے پوچھا: "حضرت، اگر ایک دَور میں دو مردِ مومن پیدا ہو جائیں تو کیا ہو؟"

ایک صاحبزادے نے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ شیروانی کے بٹن ٹوٹے رہتے تھے، پاجامہ میلا اور سلوٹوں سے بھرا ہوا، داڑھی کے بال پریشان، ٹوپی مڑی تڑی۔ بار بار وہ کلاس میں آتے جاتے، رشید صاحب کے سامنے سے گزرتے تھے۔ ایک دن رشید صاحب نے انھیں بلایا اور کہا: "حضرت! اس قسم کے لباس پر میرا کاپی رائٹ ہے۔ اسے صرف میں پہن سکتا ہوں۔ آیندہ آپ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آیا کریں۔"

ایک مصنّف شکار کے افسانے لکھا کرتے تھے۔ کسی شکار سے واپس آئے تھے اور رشید صاحب کو اپنی تازہ مہم کا حال سنا رہے تھے۔ بال خشک اور بکھرے ہوئے، خط بڑھا ہوا، چہرے مہرے اور لباس سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی شکار سے لوٹے ہیں۔ رشید صاحب گردن جھکا نہایت صبر و سکون سے ان کے قصّے سن رہے تھے۔ دورانِ گفتگو انھوں نے پوچھا: رشید صاحب، کیا آپ نے کبھی پہاڑی اُلّو دیکھا ہے؟"
رشید صاحب نے گردن اٹھائی اور انھیں غور سے دیکھا: "جی نہیں، دیکھ رہا ہوں۔"

عصمت چغتائی ایک دفعہ ان سے ملنے آئیں۔ رشید صاحب کھرپی لیے گلاب کے پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ سمجھیں، کوئی مالی ہے۔ ان سے کہا: رشید صاحب سے ملنا ہے اطلاع کر دو۔ رشید صاحب اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کو خیال ہوا کہ یہ سمجھے نہیں۔ بولیں "شاید ابھی نئے آئے ہو" رشید صاحب نے کہا: "یوں تو اس گھر میں سب سے پرانا میں ہی ہوں۔"